ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

مئی سنہ ۱۹۹۳ء

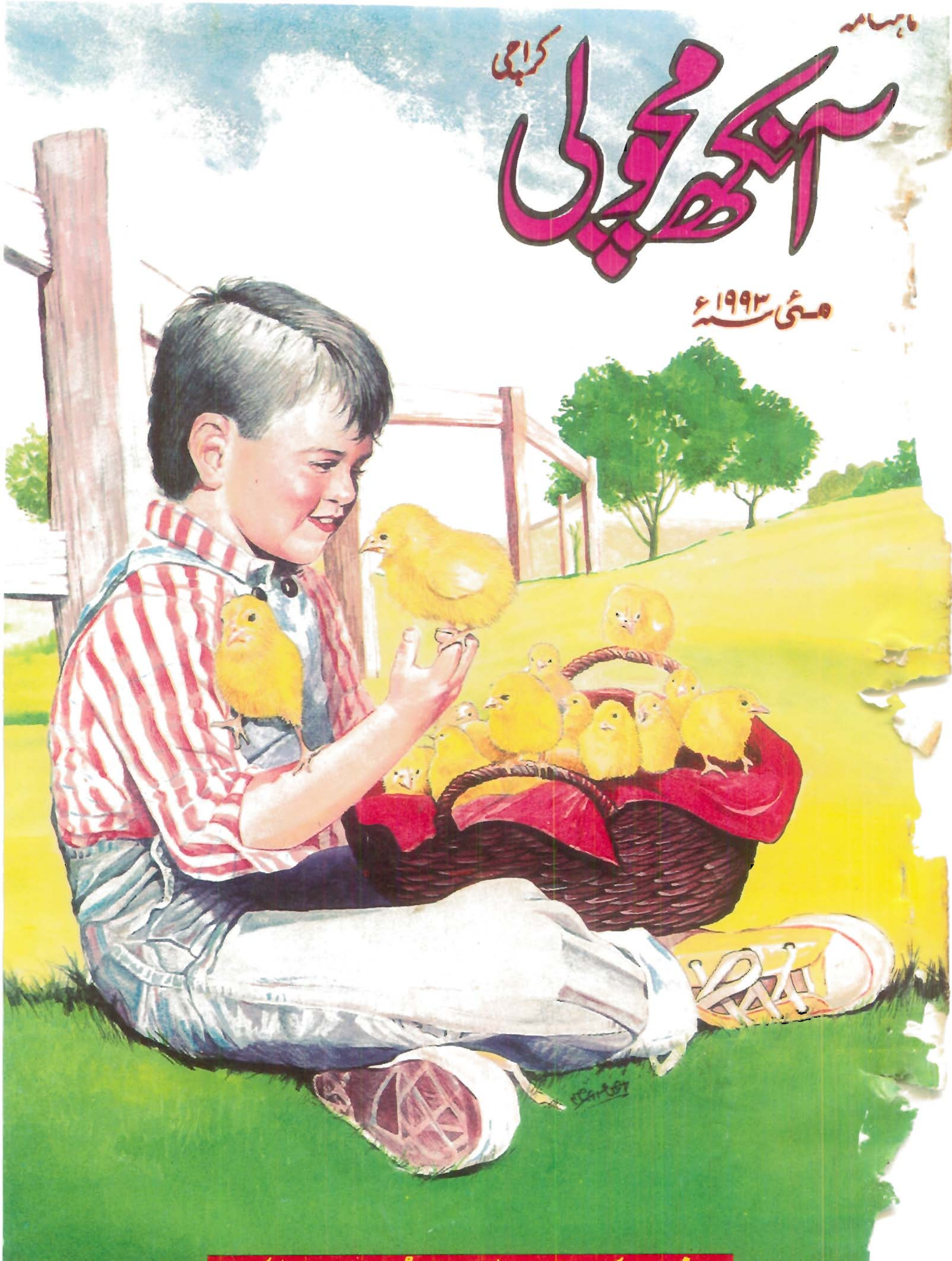

اس شمارے کے ساتھ اسٹیکر کا تحفہ مفت حاصل کریں

AHMED
Jelly Crystals
free from gelatine
Real Good
AHMED
JELLY
CRYSTALS
Fantastic
Fruity
Flavours
Nature Produces taste
Ahmed Preserves it.

آدابِ سفر

اپنے عزیزوں کو لینے یا رخصت کرنے
جب بھی آپ ریلوے سٹیشن آئیں تو
پلیٹ فارم ٹکٹ لینا نہ بھولیں ہو سکتا
ہے کہ بعد میں آپ کو پریشانی کا سامنا کرنا
پڑے

ایک قابل اعتماد نام   پاکستان ریلوے

محکمہ تعلقات عامہ

کاش ہم ۲۴ کروڑ ہوتے

- لیکن ہمارے سرکاری افسران سالانہ ۴۰ ارب روپے رشوت نہ لیتے۔
- کروڑوں ایکڑ زمین پٹے پر چند وڈیروں کو نہ دی جاتی۔
- بدعنوان سیاستدانوں اور ممبرانِ اسمبلی کی خرید وفروخت نہ کی جاتی۔
- سرمایہ داروں کو صرف قوم کی دولت بٹورنے کی فکر نہ ہوتی۔

تو آج

- ہر فرد کو تعلیم، روزگار اور علاج کی سہولتیں میّسر ہوتیں۔
- بنجر زمینیں آباد ہوتیں، لاکھوں کاشتکار غلہ اُگاتے۔
- ترقیاتی منصوبوں پر عملدرآمد کے لئے افرادی قوّت کی کمی نہ ہوتی۔
- ہر فرد خوشحال ہوتا، پاکستان ترقی یافتہ ملک ہوتا۔
- امریکہ اور یورپ پر ہماری دہشت ہوتی۔

حکمرانو!

اپنی بداعمالیوں کا الزام آنے والی نسلوں کو مت دو

پاسبان

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۱۱

ذی قعدہ/ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ مئی ۱۹۹۳ء

مدیر اعلیٰ

ظفر محمود شیخ

منتظم اعلیٰ

تجمل حسین چشتی

منیجنگ ایڈیٹر

ایم اے فاروقی

مدیر اعزازی

طاہر مسعود

مجلس ادارت

منیر احمد راشد ، محمد عمر احمد خان

نمائندہ امریکہ

عبدالرشید خان

○ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔

○ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

○ ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا ہے۔

خط و کتابت کا پتہ ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱-پی آئی بی کالونی، کراچی ۵ (۷۴۸۰۰) فون: ۴۱۱۵۸۷

ناشر: ظفر محمود شیخ ○ طابع: زاہد علی ○ مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ کراچی

قیمت ۱۰ روپے
۷ درہم ۷ ریال

آپ کو مبارک ہو

آپ کی چھوٹی سی کوشش ملک گیر تحریک بن گئی

آنکھ مچولی کے قارئین ساتھیوں نے اپنے بڑوں میں ترکِ سگریٹ نوشی کی جو مہم آج سے چھ سال قبل شروع کی تھی، اس کی بازگشت آج ملک بھر میں سنائی دے رہی ہے۔

آنکھ مچولی کی ننھی سی کوشش آج مکمل تحریک کی صورت اختیار کر چکی ہے

یہ تحریک جاری ہے .... جاری رہے گی اس وقت تک جب تک وطنِ عزیز کی عطر بیز فضا سے سگریٹ کا زہر آلود دھواں بالکل چھٹ نہیں جاتا۔

آیئے اپنے بزرگوں کی صحت و تندرستی اور درازیٔ عمر کی دُعا مانگیں اور ان کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر پھینک دیں کہ یہ ان کی اور ہماری دونوں کی دشمن ہے

حُسنِ ترتیب

تاریخ کے دریچے سے	ادارہ	۸
ماہِ رواں کی پہلی بات	اداریہ	۹
اللہ رب العالمین (نظم)	صبا اکبرآبادی	۱۰
تین سوال	سید رضوان راحت	۱۱
احمق	سلمان غزالی	۱۳
چچا چونچ کی باتیں	محمد عمر احمد خان	۲۱
بس کا انوکھا مسافر	ڈاکٹر تصدق حسین راجا	۲۴
صبح کی سیر (نظم)	حفیظ الرحمن احسن	۲۷
ایک ڈرامائی بیماری	آصف وقار آصف	۲۸
بدنصیب بیٹے	م، ندیم علیگ	۳۰
چارلس ڈکنز	عابد سلطان	۳۲
کرنیں	عثمان بن سلیم	۳۵
یوکاتاں کے چند جانور	انگر انوار اعوان	۳۹
شہر کا ماحول (نظم)	نوید ظفر کیانی	۴۱
بچاؤ	اشتیاق احمد	۴۲
ڈش انٹینا	حسن فرخ	۴۹
چمکیلی	نعیم مشتاق	۵۲
گلگلے	لطائف	۵۵
امتحان ہے آپ کی ذہانت کا	ادارہ	۶۰
(نظم) غائب دماغ	عبدالقادر	۶۴
بادشاہ کا علاج	سید نظر زیدی	۶۵
میرا آئیڈیل	سلیم خالق	۷۱
بوجھو تو جانیں	ادارہ	۷۶
(نظم) ننھا مجاہد	منور علی چشتی	۸۰
جہانگیر	سیما صدیقی	۸۱
بخدمت جناب	خطوں کے جواب	۸۷
چھوٹی سی بات	شگفتہ شمیم	۹۱
پھلوں اور ترکاریوں میں فرق	نگہت آرا چوہان	۹۵
پراسرار واقعات	محمد انعام فاروقی	۹۷
دھند	شازیہ فرحین	۹۹
دُنیا کا بلند ترین درخت	نگہت	۱۰۳
(نظم) جانوروں کے نام	محمد بن مالک	۱۰۵
چیزوں کی کہانی	آصف فرخی	۱۰۶
وہ کون تھی	عفیفہ ابراہیم	۱۱۰
فن تیراندازی کا	شیخ ظل ہما حمید	۱۱۳
اگلے دن کے کھوجی	فرزانہ جبیں	۱۱۶
قلم قتلے	ننھی تحریریں	۱۱۹

تاریخ کے دریچے سے

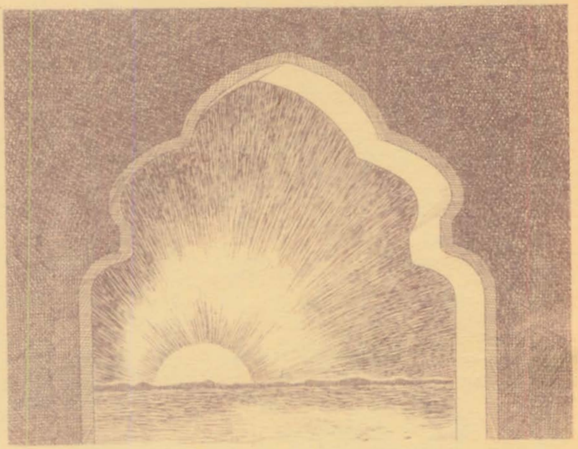

بلخ کا بادشاہ ابراہیم ادہم ایک روز جنگل میں شکار کے لئے گیا۔ اس کی غیر حاضری میں ایک کنیز اس کی خواب گاہ میں پہنچی۔ اس وقت ملکہ بھی خواب گاہ میں نہیں تھی۔ خواب گاہ کے عالیشان فرنیچر، ریشمی گدوں کے نفیس بستر اور عطر دانوں سے نکلتی ہوئی خوشبوں کی لپٹوں نے کنیز کا دل موہ لیا۔ وہ ادھر ادھر دیکھ کر احتیاط سے شاہی بستر پر لیٹ گئی۔ لیٹتے ہی نیند آگئی۔ بعض ملازموں نے اسے شاہی بستر پر سوتے دیکھ لیا اور جب بادشاہ واپس آیا تو ملازموں نے بادشاہ سے کنیز کی شکایت کر دی۔

بادشاہ نے غصے میں حکم دیا کنیز کو پچاس کوڑے مارے جائیں۔ کنیز سزا پا چکی تو بادشاہ نے اس سے پوچھا "کیا اب تم اپنے کئے پر پشیمان ہو" کنیز نے کہا۔ "ہاں بادشاہ سلامت! مجھے اپنی حرکت پر بہت افسوس ہے لیکن اس سے زیادہ افسوس آپ پر ہے۔ میں شاہی بستر پر ایک گھنٹے سوئی تو مجھے پچاس کوڑوں کی سزا ملی لیکن آپ جو برسوں سے اس بستر پر سو رہے ہیں، آپ کو آخرت میں نہ جانے کیا سزا ملے؟"

بادشاہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "اس لڑکی کو یہاں سے لے جاؤ اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ مجھے سوچنے کے لئے تنہا چھوڑ دو۔"

لڑنے جھگڑنے والے بچوں کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ بزرگ کہتے ہیں بچوں کو آپس میں لڑنا نہیں چاہئے کیونکہ لڑائی بھڑائی اچھی بات نہیں ہوتی۔ سمجھ دار بچے آپس میں میل محبّت سے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی عزّت کرتے ہیں۔ بچوں کو ایسی نصیحتیں کرنے والے بڑے اگر آپس میں خود لڑ پڑیں اور لڑائی ایسی ہو کہ دنیا دیکھے تو اسے کیا کہا جائے گا؟ اور پھر بچے تو لڑ بھڑ کر تھوڑی دیر میں سب کچھ بھول بھال جاتے ہیں اور کھیل کود میں مگن ہو جاتے ہیں۔ لیکن بڑے لڑتے ہیں تو یہ لڑائی بہت لمبی ہوتی ہے۔ اور اس کی لپیٹ میں سب کچھ آجاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ خود بچّے بھی آجاتے ہیں جن کا بڑوں کی اس لڑائی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

سچ تو یہ ہے کہ جب سے ہمارا ملک قائم ہوا ہے، بڑے آپس میں لڑتے چلے آرہے ہیں۔ جتنی توانائی انھوں نے جھگڑوں میں ضائع کی ہے، اتنی اگر اس ملک کو بنانے میں اور اس کے مسائل کو حل کرنے میں صرف کی ہوتی تو آج ہمارا ملک نہ جانے کتنی ترقی کر چکا ہوتا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ بڑے جب لڑتے ہیں تو اخلاق اور تہذیب کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک دوسرے پر جھوٹے الزامات لگاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو ملک کا دشمن ثابت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کر ڈالتے ہیں۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوچتے کہ ان کی لڑائی سے ملک میں کیسا خراب ماحول پیدا ہو رہا ہے۔ ملک میں کتنی بُری روایات قائم ہو رہی ہیں اور نئی نسل کے ذہنوں پر ان کا کتنا مہلک اثر پڑ رہا ہے۔

ذرا دیر کے لئے سوچئے ہمارے ملک کو کیسے کیسے مسائل کا سامنا ہے۔ غربت، جہالت، بیماری، مہنگائی، بدعنوانی، کام چوری، مفاد پرستی .... غرضیکہ زندگی کا ہر شعبہ مسائل کے گرداب میں پھنسا ہوا ہے۔ ایسے ملک میں جہاں اتنے سنگین اور تشویش ناک مسائل ہوں، وہاں تو ہر شہری کو تازہ جوش و جذبے سے سرشار ہونا چاہئے اور ان مسائل سے لڑنے کے لئے کمربستہ ہونا چاہئے لیکن ہمارے ملک میں بدقسمتی سے صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔

ہمارے بڑے ان مسئلوں سے نمٹنے کے بجائے آپس میں لڑ بھڑ کر ملک کے لئے نت نئے مسائل کھڑے کر رہے ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ آنکھ مچولی اپنے تمام ساتھیوں کی جانب سے ان "بڑوں" سے یہی اپیل کر سکتا ہے کہ خدارا یہ ناپسندیدہ لڑائی بند کر دیجئے۔ کروڑوں بچّوں کا مستقبل اس ملک سے وابستہ ہے لہٰذا ان بچّوں کے مستقبل سے نہ کھیلئے۔ آپ کے غیر ذمّہ دارانہ طرزِ عمل سے ملک کو نقصان پہنچا تو اس ملک کے بچّے کبھی آپ کو معاف نہیں کریں گے .... !!!

آپ کا دوست ظفر محمود شیخ

اللہ ربّ العلمین

صباؔ اکبرآبادی

نظروں پہ وہ ظاہر نہیں
ہر جا ہے وہ ہی جاگزیں
اس کا فلک اس کی زمیں
اللہ ربّ العالمین

یہ بحر و بر یہ خشک و تر
دشت و جبل شمس و قمر[١]
یہ ثابت و سیّار تاحدِّ نظر
اس کی وحدت کے امیں
اللہ ربّ العالمین

مٹی کی یہ رنگینیاں
یہ ریگزار[٢] و گلستاں
قدرت کے اُس کی ہیں نشاں
اُس کا کوئی ثانی نہیں
اللہ ربّ العالمین

ہر پھول میں رکھا ہے زر
دولت ہے اس کی کس قدر
ہر شاخ کو بخشے ثمر
مٹی سے نکلی انگبیں[٣]
اللہ ربّ العالمین

میں ہوں سراپائے خطا
تجھ سے یہی ہے التجا
ہو رحم برحالِ صباؔ
اے مالکِ دنیا و دیں
اللہ ربّ العالمین

١_ صحرا، پہاڑ، سورج، چاند
٢_ صحرا
٣_ شہد

تین سوال

سید رضوان راحت

لو .... وہ پھر آگیا .... بازار سے گزرتے ہوئے راہ گیر نے دوسرے سے کہا اور جس کے بارے میں کہہ رہا تھا وہ شخص چوراہے پر آ کھڑا ہوا اور ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ "ہے کوئی مسلمان جو میرے تین سوالوں کا جواب دے۔"

اس نے یہ جملہ تین مرتبہ کہا مگر کوئی آگے نہ بڑھا۔ پھر اس نے ایک قہقہہ لگایا اور اُتر کر واپس چلا گیا۔ "آخر کب تک یہ تماشا ہوتا رہے گا۔" ...... ایک دُکاندار نے دوسرے دُکاندار سے کہا۔ "کیا کریں بھائی وہ غیر مُسلم ہو کر مسلمانوں کو للکار رہا ہے۔ مگر ہم مسلمان اس کے سوالوں کا جواب ہی نہیں دے سکتے۔" پھر سب تھوڑی دیر بعد اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

کوئی ایک مہینہ پہلے وہ شخص نمودار ہوا تھا۔ بہت پڑھا لکھا تھا مگر تھا غیر مُسلم ...... اس نے آتے ہی تمام مسلمانوں اور عالموں کو للکارنا شروع کر دیا کہ کوئی بھی اس کے تین سوالوں کا جواب دے کر دکھائے۔ تمام مسلمان اور علما اس میں ناکام رہے۔ اس کے بعد روزانہ وہ شخص یہی جملہ دہراتا اور جب کوئی جواب نہ دیتا تو وہ اسلام کے خلاف باتیں کہتا لیکن اسے روکنے والا کوئی نہ تھا۔

اس دن اس نے اونچے ٹیلے پر چڑھ کر وہی جملہ دہرایا اور وہ ڈینگیں مار رہا تھا کہ قریب سے جاتے ہوئے ایک چھوٹے بچے نعمان نے یہ سنا۔ اس سے یہ برداشت نہ ہوا اس نے اللہ کا نام لیا اور آگے بڑھا۔ "میں تمہارے سوالوں کا جواب دوں گا۔" اس چھوٹے بچے نے رعب دار آواز

میں کہا۔ اور بازار میں موجود تمام افراد اس بچّے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "تم...... تم میرے سوالوں کا جواب دو گے۔ ...... ہاہاہا...... ہاہاہا" اور وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

ہاں انشاء اللہ میں تمہارے سوالوں کا جواب دوں گا ......" وہ بچّہ اپنے ارادے پر اٹل تھا۔

"اچھا تو میرا پہلا سوال...... بتاؤ اس وقت تمہارا خدا کیا کر رہا ہے؟"

پورا مجمع خاموش تھا۔ ایسے میں وہ لڑکا بولا "جناب بتانے والے کا درجہ پوچھنے والے سے زیادہ ہوتا ہے بس آپ اپنی جگہ سے نیچے آئیں اور میں اوپر جاؤں گا تب ہی میں آپ کے سوال کا جواب دوں گا ...." اس بچّے کی بات سن کر وہ نیچے اتر آیا اور وہ لڑکا اوپر چڑھ گیا پھر بولا "اے لوگو...... گواہ رہنا...... میرا خدا اس وقت ایک کافر کے مرتبہ کو گھٹا رہا ہے اور ایک مسلمان کے رتبے کو بڑھا رہا ہے ...." پورا مجمع بچّے کا جواب سن کر جھوم اٹھا۔ کافر کچھ شرمندہ ہوا۔

"بتاؤ تمہارا دوسرا سوال کیا ہے......؟" بچّے نے پوچھا۔

یہ بتاؤ خدا سے پہلے کیا تھا؟" کافر نے سوال کیا۔

"پہلے تم دس سے الٹی گنتی شروع کرو۔" بچّے نے کہا۔

اس نے الٹی گنتی شروع کی "دس...... نو آٹھ سات...... چھ...... پانچ...... چار...... تین...... دو...... ایک" اور پھر چپ ہو گیا۔

"بولو رک کیوں گئے؟ گنو گنتی" ...... "مگر اس سے پہلے تو کچھ نہیں ہے۔" کافر بولا۔

"لوگو! ...... گواہ رہنا۔ اللہ بھی ایک ہے اور ایک اللہ سے پہلے کیا ہو سکتا ہے......؟" یہ جواب سن کر کافر بالکل ہکّا بکّا رہ گیا۔ اسے پسینے آنے لگے۔

"تیسرا سوال......" اس دفعہ مجمع چلایا اور کافر نے پوچھا۔

"یہ بتاؤ خدا کا منہ کس طرف ہے؟" لڑکے نے کچھ دیر سوچا پھر کہا "ایک موم بتی لاؤ۔" فوراً ایک موم بتی لائی گئی۔ پھر اس کو روشن کیا گیا۔ پھر اس بچّے نے کافر سے پوچھا "یہ بتاؤ اس موم بتی کی روشنی کا منہ کس طرف ہے............؟"

"چاروں طرف۔" کافر بولا۔

"لوگو! ...... گواہ رہنا...... اللہ بھی ایک نور ہے یعنی روشنی ہے اور وہ بھی چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ وہ ہر طرف موجود ہے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔" اور تیسرے سوال کا جواب سن کر تو کافر کا منہ بالکل بند ہو گیا۔ اس کو شکست فاش ہو گئی اور اللہ نے یہ کام ایک بچّے سے لیا۔

یہ بچہ بڑا ہو کر وقت کا سب سے بڑا امام بنا۔ جی ہاں......!

یہ بچّہ "حضرت امام ابو حنیفہ" تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بچپن ہی سے کفر کے خلاف جنگ کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی تھی۔

احمق

سلمان غزالی

"واک مین" کے ہیڈ فون میرے کانوں پر لگے ہوئے تھے اور میں اِرد گرد سے بے خبر لان میں ایزی چیئر پر دراز کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔ اچانک سامنے نظر پڑی تو بالے ہاتھ سے اشارے کرتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ اس کے ہونٹ ہلتے دکھائی دیئے اور کچھ مبہم سے الفاظ کانوں سے ٹکرائے۔ وہ یقیناً مجھے پکار رہا تھا۔ میں نے ہیڈ فون اُتارتے ہوئے اس سے کہا "کیا بات ہے بالے؟"

"ارے صاحب میں کب سے آوازیں دے رہا ہوں ...... بڑے مالک نے بلایا ہے آپ کو مگر آپ تو سُنتے ہی نہیں۔" بالے زور زور سے بولتا ہوا میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"ہاں! وہ اس کی وجہ سے میں سُن نہیں سکا۔" میں بٹن کے سائز کے ہیڈ فون گود سے اُٹھا کر میز پر رکھتے ہوئے بولا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

یعنی کوئی چیز ہے یہ، اچھا خاصا آدمی بہرہ ہو جاتا ہے۔" بالے نے کھا جانے والی نظروں سے ہیڈ فون کو دیکھا۔

"ارے تم نہیں جانتے اس شور مچاتی دنیا میں کبھی کبھی بہرہ ہو جانے میں کتنا مزہ آتا ہے۔" میں نے جاتے ہوئے اس کا کاندھا تھپتھپایا اور اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پر حماقتیں برسنے لگی تھیں۔ وہ صرف شکل سے ہی احمق نہیں نظر آتا تھا بلکہ تھا بھی بہت بُدّھو اور جذباتی۔

میں پندرہ منٹ بعد واپس آیا تو بالے کرسی کے پاس سر جھکائے بیٹھا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا ہے۔ میں نے غور کیا تو اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ رو تا رہا ہے۔ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا "کیا ہوا بالے ...... کسی نے کچھ کہا ہے؟" "طارق بابو جب کوئی مجھے گالی دیتا ہے نا تو میرا دل چاہتا ہے کہ اس کی زبان کھینچ لوں یا اپنے کانوں میں سیسہ ڈلوا لوں۔" بالے بولتا گیا۔ "صاحب مجھ سے لوگوں کی گالیاں نہیں سُنی جاتیں مگر میں کیا کروں میں غریب اور مجبور ہوں کچھ نہیں کر پاتا۔"

"ارے بتا تو سہی کہ ہوا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا صاحب! میرا پاؤں لگنے سے نل پر سے ٹیوب اتر گئی اور مالی کے کپڑے بھیگ گئے۔ بس اسی بات پر مالی نے مجھے پکڑ کے مارا اور بہت گالیاں دیں۔"

"تو پریشان نہ ہو میں مالی کو ڈانٹ دوں گا۔" میں نے اسے تسلّی دی۔

"ارے صاحب یہ تو روز کی بات ہے گھر میں مالک سے، کھیل میں بڑے لڑکوں سے بازار میں سپاہی، دُکاندار سے گالیاں سُننا تو میرا نصیب بن چکا ہے۔" اس نے میلے کف سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا اور اس کے لہجے کی تلخی نے جیسے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ بے شک بے وقوف تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ بہت ہی حسّاس لڑکا تھا اور اسی لئے میں اس کا خاص خیال رکھتا تھا اور میری تسلّی سے وہ ہمیشہ نارمل ہو جاتا تھا۔

بالے کی عمر مشکل سے بارہ تیرہ سال ہوگی۔ وہ ایک یتیم اور بے سہارا لڑکا تھا اس کا آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ میرے والد اسے گاؤں سے لے کر آئے تھے۔ وہ گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتا تھا اور ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اس میں ایک ہی خرابی تھی کہ ہر کام میں وہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ کر دیتا تھا۔ اسی لئے اسے کسی نہ کسی سے ڈانٹ ہی پڑتی رہتی تھی جس کے بعد وہ دل ہی دل میں کُڑھتا رہتا تھا۔ میں اس کے احساسات کو سمجھتا تھا اس لئے اسے کبھی بُرا بھلا نہ کہتا اور اس کا خیال رکھتا۔ وہ بھی مجھ سے ہر بات کُھل کر کر لیتا تھا۔ مگر اس کی ایک بات مجھے بہت کھٹکتی تھی اور وہ اس کی نگاہ تھی۔ جب بھی روپے پیسے پر اس کی نگاہ پڑتی تو

آنکھوں میں حسرت کے ساتھ ایک چمک سی پیدا ہو جاتی جیسے وہ روپوں کو جھپٹ لینا چاہتا ہو۔ اس کی یہ نگاہیں مجھے خوفزدہ کر دیتی تھیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ حالات اسے مجرم بنا دیں۔ اسی لئے میں ہمیشہ روپیہ پیسہ اس سے چھپا کر رکھتا اور اسے زیادہ ادھر ادھر جانے بھی نہیں دیتا۔

بالے کو تسلی دینے کے بعد میں اندر اپنے کمرے میں آ گیا۔ امی کہیں گھر سے باہر گئی ہوئی تھیں اور اب ابو بھی کہیں باہر جا رہے تھے۔ جانے سے پہلے وہ مجھے ایک بڑی رقم پکڑا گئے تھے کہ جب امی واپس آ جائیں تو میں انہیں دے دوں۔ میں نے اپنی میز کی دراز کھولی اور رقم جیب سے نکال کر دراز میں رکھ دی۔ دراز بند کر کے میں مڑا تو پیچھے بالے کھڑا تھا۔ اس کی نظریں دراز پر جمی ہوئی تھیں۔ میں گھبرا گیا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو بالے؟" میں نے اسے ڈانٹا۔ "یوں چوری چھپے کیوں اندر آئے ہو؟" میرے سخت لہجے پر وہ گڑبڑا گیا۔ "وہ...... وہ...... میں بتانے آیا تھا کہ باہر کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے تم چلو باہر۔" میں نے جان بوجھ کر پھر سخت لہجے میں کہا۔ بالے تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

باہر میرا ایک دوست آیا ہوا تھا۔ میں اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ ہم دونوں کافی دیر تک وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ دوست کو رخصت کرنے کے بعد جب میں دوبارہ اندر آیا تو بالے مجھے کہیں نظر نہ آیا۔

"بالے...... بالے۔" میں نے دو تین دفعہ اسے پکارا تو گھریلو ملازمہ حاجراں آ گئی۔

"کیا بات ہے صاحب، بالے تو نہیں ہے۔" اس نے آتے ہی کہا۔

"نہیں ہے! کہاں گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں صاحب وہ بتا کر نہیں گیا۔" حاجراں نے جواب دیا۔

"بتا کر نہیں گیا!" میں نے حیرت سے کہا کیونکہ یہ اس کی عادت نہیں تھی۔

"ہاں صاحب بس چپ کر کے کہیں نکل گیا ہے اور ایک بات کہوں صاحب مجھے تو اس پر شک ہے۔" حاجراں میرے قریب آ گئی تھی۔

"شک!؟" میرے منہ سے نکلا "مگر بات کیا ہے؟" مجھے اب کہیں کچھ غلط محسوس ہونے لگا تھا۔

"وہ صاحب میں نے بالے کو بڑی افراتفری کے عالم میں آپ کے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ ادھر ادھر دیکھتا جا رہا تھا۔ بڑا گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ جب میں نے آواز دی تو گڑبڑا گیا۔ بجائے رکنے کے وہ اور تیز ہو گیا اور دور ہی سے مجھے "ابھی آتا ہوں" کہہ کر باہر کی طرف نکل گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے قمیض میں کچھ چھپایا ہو۔ آپ اس وقت اپنے دوست کے ساتھ ڈرائنگ روم میں

تھے۔ آپ کا وہ بہت لاڈلا ہے نا اس لئے میں روک کر پوچھ بھی نہ سکی۔" حاجراں کے آخری جملے میں شکایت تھی۔ اور یہ شکایت تمام ہی ملازموں کے دل میں تھی جسے وہ زبان پر نہیں لاتے تھے کیونکہ میں بالے کا بہت خیال کرتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہی ہو گیا ہے جس کا مجھے ڈر تھا۔ میں حاجراں کو وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف لپکا اور تیزی سے میز کی دراز کو کھولا۔ رقم اس میں موجود نہ تھی۔ میں تو جیسے سناٹے میں آ گیا۔ بالے نے میرے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ غصے کے مارے میری کنپٹیاں جلنے لگیں۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر حاجراں کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بالے کے خلاف کچھ سننے کے لئے کھڑی ہے۔ میں چپ چاپ لان کی طرف نکل آیا۔ اتنے میں بالے گیٹ سے اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہی میں زور سے دہاڑا "بالے......" بالے میری آواز سے سہم گیا تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے میرے پاس آیا وہ بد حواس لگ رہا تھا۔

"بالے تم نے میری دراز کھولی تھی؟" میں نے غصّے سے پوچھا۔

"جی......" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"تم نے چوری کی ہے؟" اب مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا تھا۔

"وہ ...... صاحب ...... در ...... اصل" وہ ہکلانے لگا۔

"بکواس بند کرو اور بتاؤ کہ کیا تم نے چوری کی ہے؟"

جی......" اس نے مریل آواز میں کہا۔

"تڑاخ" میرا ہاتھ گھوم گیا۔ بالے کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور سر جُھک گیا۔ حاجراں، مالی اور چوکیدار سب اتنی دیر میں وہاں آ چکے تھے۔ پھر میں نے بالے کو گریبان سے پکڑ لیا "تمہیں شرم نہیں آئی یہ سب کرتے ہوئے، میں نے ہر طرح سے تمہارا خیال کیا۔ تمہیں بھائیوں کی طرح سمجھا، تم پر اعتبار کیا اور تم نے میری عزّت کا ذرا سا بھی خیال نہیں کیا۔" میں اسے بُرا بھلا کہتا رہا اور وہ سر جُھکائے سُنتا رہا۔ اتنے میں چوکیدار ایک سپاہی کو اندر لے آیا جو اس علاقے میں اکثر گشت کرتا رہتا تھا۔ "یہ لڑکا ہے جس نے چوری کی ہے۔" چوکیدار نے بالے کی طرف اشارہ کیا اور سپاہی نے آتے ہی ایک ہاتھ بالے کی گُدّی پر رسید کیا۔ "کیوں بے! احسان فراموشی کرتا ہے؟" پھر مجھ سے مخاطب ہوا، "آپ فکر نہ کریں جناب! اسے تو میں ٹھیک کر دوں گا اور مال بھی بر آمد ہو جائے گا۔ ویسے کتنا مال تھا؟"

"دس ہزار۔" میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

"سور کا بچہ۔" سپاہی نے رقم سن کر ایک زور دار ہاتھ بالے کو رسید کیا اور وہ زمین پر جا گرا۔ "مگر" بالے نے کچھ کہنا چاہا لیکن ایک زور دار لات نے اسے دہرا کر دیا اور مغلظات کا ایک طوفان

سپاہی کے منہ سے اُبل پڑا۔ پھر وہ بالے کو گھسیٹتا ہوا لے گیا اور میں چاہتے ہوئے بھی اسے نہ روک سکا۔ میں اپنے آپ میں نہیں تھا۔ میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور بستر پر گر گیا۔ تھوڑی دیر میں نارمل ہوا تو اچانک ایک خیال ذہن میں آیا اور میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "رقم تو میں نے اوپر والی دراز میں رکھی تھی اور تلاش نچلی دراز میں کیا۔" میں نے کانپتے ہاتھوں سے اوپر والی دراز کھولی رقم وہاں موجود تھی۔ "تو پھر بالے نے چوری کا اعتراف کیوں کیا؟" میرا ذہن چکرا گیا۔ میں نے پہلی دراز کو کھولا اور پھر مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے اندھے کنویں میں دھکیل دیا ہو۔

بالے نے واقعی چوری کی تھی۔ اوپر والی دراز سے میرے "ہیڈ فونز" غائب تھے اور بالے کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے "صاحب اب مجھ سے لوگوں کی اور گالیاں نہیں سُنی جاتیں۔"

میگی نوڈلز انعامی مقابلہ نمبر ۱

میگی نوڈلز انعامی مقابلہ نمبر ۱ کے خوش نصیب انعام یافتگان کا اعلان جون ۹۳ء کے ماہنامہ آنکھ مچولی میں کیا جائے گا۔ (ادارہ)

آنکھ مچولی کی یادگار فخریہ پیشکش

مُلک کے مایہ ناز سائنس داں

ڈاکٹر عبدالقدیر خان

کی آنکھ مچولی کے لیے خصوصی تحریر

"میرے بچپن کی یادیں"

اگلے شمارے میں مُلاحظہ کیجئے

اِس مضمون میں پہلی بار ڈاکٹر صاحب نے اپنے بچپن کے دلچسپ اور سبق آموز واقعات پر سے پردہ اٹھایا ہے

مناسب دام - بہت آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے پایئے

86 روپے بچایئے

آنکھ مچولی کے ۱۰ عام اور ۲ خاص شماروں کی سالانہ قیمت مع رجسٹرڈ ڈاک خرچ ۲۳۶ روپے بنتی ہے

مگر!

ممبر شپ حاصل کرنے پر ۸۶ روپے کی خصوصی بچت

آپ ہمیں ۱۵۰ روپے کا منی آرڈر روانہ کر دیجئے ہم آپ کو سال بھر آنکھ مچولی باقاعدگی سے بھجواتے رہیں گے۔

- منی آرڈر فارم پر اپنا مفصل نام اور پتہ ضرور لکھئے۔
- مشرقِ وسطیٰ کیلئے ۴۰۰ روپے
- امریکہ اور یورپ کیلئے ۵۰۰ روپے

منی آرڈر اس پتے پر روانہ کریں

ماہ نامہ آنکھ مچولی - 1 - پی - آئی - بی کالونی، کراچی - ۵

فرقان وہاب کی شوخیاں

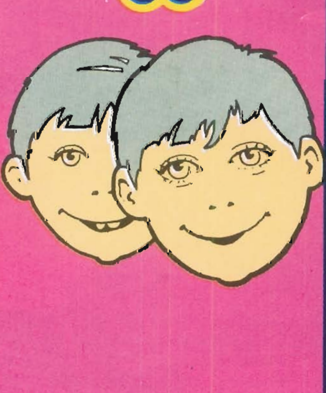

میرے خیال میں یہ "پوز" ٹھیک رہے گا......!!!

شرارتیں کرنا اور پیڑ پر چڑھ کر امرود توڑنا مجھے اچھا لگتا ہے.....!!!

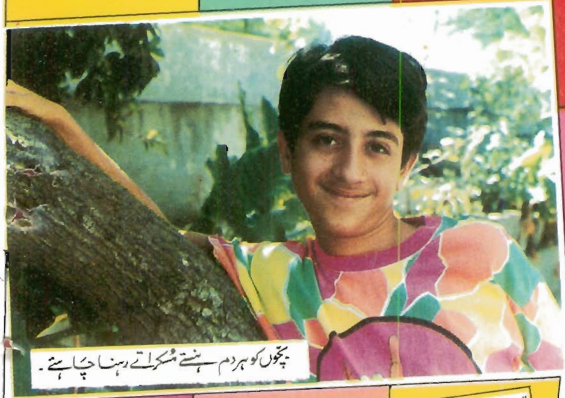

بچوں کو ہر دم ہنستے مسکراتے رہنا چاہئے۔

"جی کیا کہا؟ چچا چونچ.....!!
نہیں بھئی! میرا اصلی نام
تو نبیل نور ہے۔"

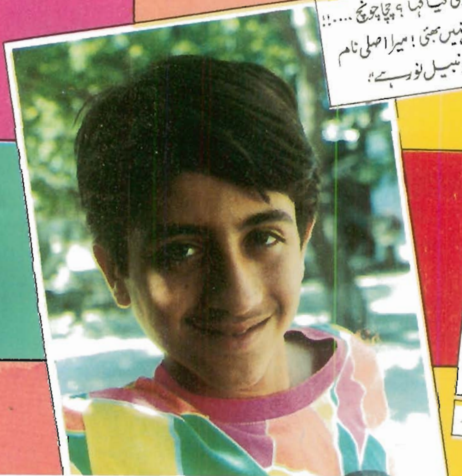

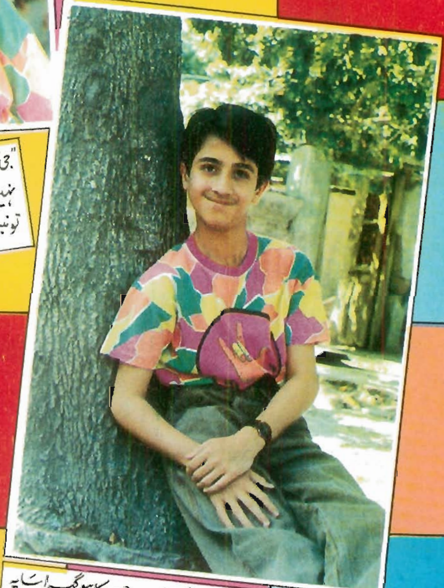

اللہ مجھ کو پیڑ بنا   جس کا ہو گھنا سایہ

چچا چونچ سے باتیں

محمد عمر احمد خان

تصاویر: مومن رحیم

حال ہی میں کراچی مرکز سے بچّوں کے لئے ڈرامہ سیریل "چچاچونچ" پیش کی گئی جسے نہ صرف بچوں نے بڑی دلچسپی سے دیکھا بلکہ بڑوں نے بھی خاصا پسند کیا۔

بچّوں کی پسند اور دلچسپی کے پیشِ نظر ہم نے اس ڈرامے میں مرکزی کردار ادا کرنے والے بچّے "نبیل" کا ایک مختصر سا انٹرویو کیا ہے جو یقیناً آنکھ مچولی کے ساتھیوں کو پسند آئے گا۔

نبیل کا پورا نام نبیل نور ہے۔ وہ سینٹ مائیکل کونوینٹ اسکول کلفٹن میں ساتویں جماعت کے طالب علم ہیں اور چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہیں۔ وہ روشنیوں کے شہر کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخِ پیدائش ۲۸ دسمبر ۱۹۷۹ء ہے۔

"یہ آپ پڑھتے پڑھتے ٹی وی پر کس طرح آگئے؟ کیا پڑھائی سے دل اچاٹ ہو گیا تھا؟" نبیل سے ہمارا یہ پہلا سوال تھا۔

یہ سوال سُن کر نبیل تھوڑا سا مُسکرائے، کچھ گھبرائے بھی پھر سنبھل کر یوں گویا ہوئے، "دراصل مجھے اداکاری کا شوق تھا۔ اسکول میں مختلف ڈراموں میں حصہ لیتا رہا۔ یہی شوق ٹی وی تک لے گیا۔ پڑھائی سے میرا دل ہرگز اُچاٹ نہیں۔ اداکاری کے ساتھ ساتھ میں پڑھائی پر بھی پوری توجہ دیتا ہوں"۔

"ٹی وی پر کام کرنا کیسا لگا؟ کیمرے کے سامنے تو یقیناً آپ کو گھبراہٹ ہوئی ہوگی!!" ہم نے اگلا سوال کیا۔

"گھبراہٹ اس لئے نہیں ہوئی کہ ٹی وی پر میرا یہ پہلا ڈرامہ نہیں تھا۔ میں اس سے پہلے بھی ٹی وی کے اشتہارات میں اور مختلف مختصر دورانئے کے ڈراموں میں کام کر چکا ہوں"۔ نبیل نے بڑے اعتماد کے ساتھ بتایا۔

"اچھا!" ہمیں حیرت ہوئی کیوں کہ نبیل بڑے کم گو اور شرمیلے نظر آ رہے تھے۔ "آپ

○ "چچا چونچ" کے پروڈیوسر ذوالفقار حسین نقوی بچّوں کے لئے ٹیلی وژن پر ڈرامے پیش کر کے خاصے مشہور ہو چکے ہیں۔ ویسے وہ اب تک تقریباً ڈھائی سو "پلے" پروڈیوس کر چکے ہیں جن میں اُردو اور سندھی دونوں زبانوں کے ڈرامے شامل ہیں۔ بچّوں اور بڑوں میں ان کے جو ڈرامہ سیریل مقبول ہوئے ان میں "بورڈنگ ہاؤس" "بچّوں کا تھیٹر" "جن چاچا" اور "بچّوں کی کونسل" سرِفہرست ہیں۔

○ ان کا ڈرامہ سیریل "چچاچونچ" بھی بچّوں اور بڑوں میں بے حد مقبول ہوا ہے۔ یاد رہے کہ چچاچونچ مرزا ادیب کے بچّوں کے لئے لکھے گئے ناول پر فلمایا گیا جس کی ڈرامائی تشکیل سلیم جلالی نے کی ہے۔

کون کون سے اشتہارات میں کام کر چکے ہیں؟"
ہمارا یہ سوال سُن کر نبیل نے کچھ دیر سوچا پھر کہا۔

"ٹِک ٹِک، زوم کلر، نیچرل ٹوتھ پیسٹ، ڈائمنڈ سُپریم اور احمد ٹماٹو کیچپ۔ اس کے علاوہ صبح کی نشریات میں پیش کیا جانے والا ڈرامہ "اِرشاد وِلا" میں بھی اداکاری کر چکا ہوں۔" (یاد رہے کہ یہ ڈرامہ ۲۶ قسطوں پر مشتمل تھا)

"کیا گھر والے آپ کی اس اداکاری کے شوق سے خوش ہیں؟" ہم نے گھر والوں کی رائے جاننا چاہی۔ نبیل مُسکرائے پھر بولے،

"ابّو تو کچھ نہیں کہتے البتہ امّی جان تھوڑا سا ناراض ہوتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ڈراموں میں کام کی وجہ سے پڑھائی کا حرج نہیں ہونا چاہیئے۔ !!"

"تو اس کا مطلب ہے کہ ڈراموں میں کام کی وجہ سے پڑھائی کا حرج ہوتا ہے؟"

"ہاں تھوڑا بہت! لیکن میں اپنی پڑھائی کو "کَوَر" کر لیتا ہوں"۔

"آپ کو چچا چونچ میں اپنا کردار کیسا لگا؟"
اس بار سیّد کاشان جعفری نے سوال کیا۔ (سیّد کاشان جعفری انٹرویو کے لئے ہمارے ساتھ ہی گئے تھے) کاشان کے سوال کے جواب میں نبیل نے کہا،

"اپنا کردار مجھے اچھا لگا کیوں کہ یہ ایک یتیم بچّے کا کردار تھا جو سب سے محبّت کرتا ہے۔ دوسرے بچّوں کی نسبت میرا مزاج اور میرا حُلیہ بالکل الگ دِکھایا گیا۔ میرا کردار جانوروں سے محبّت کرتا ہے اور اسے ایک گدھے سے اُنسیت ہو جاتی ہے۔ گدھا گُم ہو جاتا ہے تو وہ اسے ڈھونڈنے جنگل کی طرف نکل جاتا ہے۔"

"کیا حقیقی زندگی میں بھی آپ گدھے سے پیار کرتے ہیں؟" یہ سوال سُن کر نبیل ہنس پڑے۔ کہنے لگے، "حقیقی زندگی میں گدھے سے تو ظاہر ہے واسطہ نہیں پڑتا البتہ دوسرے جانوروں سے مجھے بہت پیار ہے۔"

"اچھا یہ آپ کو چچا چونچ کیوں کہا گیا؟"
کاشان نے نبیل کے خاموش ہوتے ہی دوسرا سوال کر ڈالا۔

نبیل مُسکرائے پھر بولے: "میرا مزاج اور میرا حُلیہ دوسرے بچّوں سے بالکل الگ تھلگ دکھایا گیا ہے اس لئے بچّے مجھے "چچا چونچ" کہہ کر پُکارتے ہیں"۔

نبیل کی اس "نہیں نہیں سے سبھی بہت محظوظ ہوئے۔

"کیا محلّے میں بھی بچے آپ کو "چچا چونچ" کہہ کر پُکارتے ہیں؟"

ہم نے بڑے یقین سے پوچھا تو نبیل نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جلدی سے کہا "نہیں! نہیں!! بچّے مجھے نبیل کہہ کر ہی پُکارتے ہیں۔"

"نبیل! اس ڈرامے کے کس کردار نے آپ کو سب سے زیادہ مُتاثر کیا؟"

"کردار تو سب ہی اچھے تھے لیکن "حکیم جی" کے کردار نے "کامیڈی" ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ مُتاثر کیا۔"

"اس کا مطلب ہے بچّوں کے لئے کامیڈی ہونی چاہیے؟"

"ہاں جی! بالکل ہونی چاہیے!!" نبیل فوراً راضی ہو گئے۔

"چچا چونچ میں بچّوں کو کیا پیغام پہنچایا گیا ہے؟"

"انسانوں سے محبّت، آپس میں مِل جُل کر رہنا، جانوروں سے محبّت اور رحم کا برتاؤ۔ تعلیم کو عام کرنا۔ مشکل حالات میں گھر کر اس سے نپٹنے کا حوصلہ رکھنا وغیرہ وغیرہ۔"

"آپ نے اس ڈرامے سے کیا کچھ سیکھا؟"

"بہت ساری اچھّی باتیں! اور پھر اس ڈرامے سے مجھے اپنی بہت سے خامیوں کا بھی پتہ چلا۔"

"مثلاً کس قسم کی خامیوں کا؟"

"یہی کہ میری اداکاری کہاں کہاں کمزور رہی۔"

نبیل کرکٹ بھی کھیلتے ہیں اور فاسٹ بولر ہیں۔

"کبھی کسی کو آوٹ بھی کیا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"ہاں جی!" نبیل نے بڑے یقین سے کہا تو ہمیں یقین آ گیا۔

"اچھّا! کرکٹ میں آپ کے پسندیدہ کھلاڑی کون سے ہیں؟" کاشان کا یہ سوال سُن کر نبیل نے بتایا کہ عامر سہیل اور وسیم اکرم ان کے پسندیدہ کِھلاڑی ہیں۔

"اسکول میں کون کون سے مضامین اور کون کون سے ٹیچرز آپ کو اچھے لگتے ہیں۔ اس بار ہم نے سوال کیا تو نبیل کچھ دیر تک سوچتے رہے پھر بولے۔ "ہسٹری، سائنس اسلامیات میرے پسندیدہ مضامین ہیں۔ اسکول کے تمام ٹیچرز اچھّے لگتے ہیں۔ لیکن مس ناہید جو جغرافیہ، تاریخ اور اسلامیات پڑھاتی ہیں، مجھے بے حد پسند ہیں کیوں کہ وہ بچّوں کو بڑی شفقت اور محبّت سے پڑھاتی ہیں۔"

"اچھا نبیل! مستقبل میں کیا ارادے ہیں؟ یقیناً اداکار بننے کا پروگرام ہو گا۔"

ہم نے انٹرویو کو سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں جی! اداکاری تو میں شوقیہ کر رہا ہوں۔ مستقبل میں فی الحال پڑھنے لکھنے ہی کا پروگرام ہے۔"

"اپنے ساتھیوں کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟" یہ ہمارا آخری سوال تھا۔

"ہاں جی ضرور!" نبیل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میری تمام ساتھیوں سے درخواست ہے کہ وہ بڑوں کا ادب کریں، سب کے ساتھ پیار محبّت سے پیش آئیں اور اپنی پڑھائی پر پوری توجّہ دیں۔"

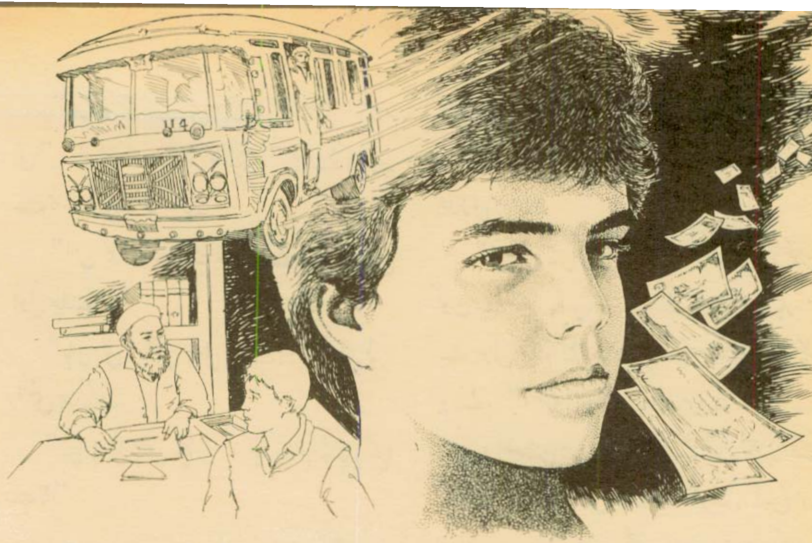

بس کا انوکھا مسافر

ڈاکٹر تصدق حسین راجا

اومنی بس آج بھی حسبِ معمول مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ روٹ نمبر ۶ پر صرف گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی بسیں چلتی تھیں جو تعداد میں بہت کم تھیں۔ اس روٹ پر سفر کرنے والوں کو گھنٹوں دھوپ بارش اور سخت سردی میں کھلے آسمان تلے انتظار کی مشکل گھڑیاں گزارنی پڑتی تھیں اور بس آتی تو دھکم پیل میں عورتیں بچے اور بوڑھے تو بڑی مشکل سے آخر میں سوار ہو سکتے۔ بیچارے سوار کیا ہوتے کھڑا ہونے کی جگہ ملتی جسے غنیمت سمجھتے۔

اویس دسویں جماعت کا طالب علم تھا، وہ کھلاڑی بھی تھا اور جسمانی طور پر بہت مضبوط جسم کا مالک بھی۔ اس کے لئے بس میں سب کو پیچھے دھکیل کر خود پہلے سوار ہو جانا کوئی مشکل بات نہ تھی مگر اس بس اسٹاپ پر انتظار کرنے والے مسافر اسے حیرت اور محبت کے ملے جلے جذبات سے دیکھا کرتے تھے کیونکہ وہ سب سے آخر میں سوار ہوتا اور بچوں بوڑھوں کو بس میں سوار کرانے میں ہمیشہ مدد گار ثابت ہوتا تھا۔ اویس کو آج کچھ

جلدی تھی کیونکہ اس کے اسکول کی ہاکی ٹیم کو ۹ بجے تک اسلامیہ اسکول پہنچنا تھا اور وہ اس ٹیم کا کپتان تھا۔ وہ بس میں سوار ہوا تو خلافِ معمول کھڑے ہوئے مسافر کم نظر آئے اور اسے بھی بیٹھنے کو سیٹ مل گئی۔ کنڈیکٹر ابھی خواتین والے حصّے میں ٹکٹ دینے میں مصروف تھا کہ بس چاندنی چوک اسٹاپ پر رکی اور ایک باریش شخص اویس کو روپیہ تھما کر اُتر گیا، "بیٹے کنڈیکٹر آئے تو میرا ٹکٹ بھی لے لینا"۔

اویس دور تک اس مسافر کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ ان بسوں میں تو اس قدر بھیڑ رہتی ہے کہ لوگ کنڈیکٹر کا انتظار کئے بغیر ٹکٹ کے پیسے جیب میں سنبھالے، اترنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو پچاس سال کی عمر میں بھی طالب علمی کا سرٹیفکیٹ، کارڈ کی شکل میں تھامے "اسٹوڈنٹ ٹکٹ" پر چار آنے میں کئی سال سے سفر کر رہے ہیں۔ چند ایک جیب ٹٹولتے ٹٹولتے اتر جاتے ہیں، اِکّا دُکّا ایسے بھی ہیں جو اگلی یا پچھلی سیٹوں کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں کہ ان کا ٹکٹ ان کے کسی ساتھی نے خرید لیا ہے اور جب تک کنڈیکٹر تصدیق کے لئے واپس ان کے پاس پہنچتا ہے، وہ بس سے اُتر کر ہنستے، مسکراتے دور جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر یہ کیسا شخص ہے جو بلا ٹکٹ سفر نہیں کرتا۔

"ایسے لوگ بھی ہمارے معاشرے میں ابھی موجود ہیں"۔ اسے یہ سوچ کر عجیب طرح کا اطمینان ہوا۔

اس مسافر کا چہرہ کئی روز تک اویس کی نظروں کے سامنے رہا اور اسکا جی چاہا کہ اس سے ایک بار اور ملاقات ہو۔ وہ صبح بس میں سوار ہوتا تو سب سے پہلے پوری بس کے مسافروں کو ایک ایک کر کے دیکھتا کہ شاید اس شخص سے ملاقات ہو جائے مگر کئی ماہ گزر جانے پر بھی ایسا نہ ہوا۔ رفتہ رفتہ اویس یہ واقعہ بھول چکا تھا کہ پھر ایک روز اسے کسی کام کے سلسلے میں ثانوی تعلیمی بورڈ کے دفتر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس کے ایک دوست کی میٹرک کی سند گم گئی تھی جو بورڈ کے دفتر کے چکر لگا لگا کر تھک گیا تو اس نے یہ کام اویس کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ متعلقہ شعبے میں داخل ہوا تو سامنے بس میں ٹکٹ کے لئے اسے پیسے دے کر اُتر جانے والا مسافر نظر آیا۔ میز پر اس کے نام کی تختی رکھی ہوئی تھی۔ محمد منیر چیمہ۔ وہ بہت خوش ہوا کہ اس کے دوست کا کام تو اب فوراً ہو جائے گا۔ اس لئے کہ بورڈ کے دفتر میں بیٹھے ہوئے اس شخص کی دیانتداری کا تو وہ پہلے ہی سے قائل تھا۔ اویس نے تمام کاغذات جیب سے نکال کر آگے بڑھا دیئے "یہ کیا ہے"؟ چیمہ نے پوچھا۔

"سر میرے ایک دوست کی میٹرک کی سند گم گئی ہے۔ ڈپلیکیٹ سند جاری کرانی ہے۔" اویس نے جواب دیا۔

"اس کام کے لئے مقررہ فیس آپ نے جمع کرا دی ہے"؟ چیمہ نے پوچھا۔

دنیا کا سب سے لمبا سانپ

دنیا کا سب سے لمبا سانپ پائیتھون اژدھا (PYTHON) ہے جو زیادہ تر مالے اور اس سے ملحق استوائی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی لمبائی بعض اوقات ۳۰ فٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ اپنے شکار کے گرد لپٹ کر اس کی سانس کی آمد و رفت روک دیتا ہے۔ جب اس کا شکار ہلاک ہو جاتا ہے تو یہ اسے سالم نگل لیتا ہے۔ یہ اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ ایک بیل کو بھی مار سکتا ہے مگر یہ چھوٹے حیوانوں کا شکار کرتا ہے جنہیں یہ نگل سکے۔ اگر اس کو شکار نگلنے کے ذرا دیر بعد چھیڑا جائے تو یہ پورے کا پورا شکار ویسا ہی اگل دیتا ہے۔ یہ کبھی کبھار ہی انسانوں پر حملہ کرتا ہے۔ یہ زہریلا نہیں ہوتا انا کونڈا اژدھا (ANACO-NDA) برازیل، پیرو اور گنی کے دریائی اور دلدلی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی لمبائی بھی بعض اوقات پائیتھون اژدھے سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا شکار مگرمچھ بھی ہوتے ہیں۔ جس دریا میں یہ موجود ہوتا وہاں آپ کو مگرمچھ نہیں ملیں گے۔

مرسلہ: سید عدنان یوسف، کراچی

"جی سر! فیس بھی جمع کرا دی ہے اور بورڈ کی باقی کی ساری شرائط بھی پوری کر دی ہیں" ۔ اویس نے جواب دیا۔

ابھی سوال و جواب کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک صاحب اندر داخل ہوئے اور چیمہ صاحب ان سے گفتگو میں مصروف ہو گئے۔

اویس نے دیکھا میز پر ایک ٹیبل کیلنڈر بھی پڑا تھا جس پر مہینے کا نام اور مہینے کی تاریخوں کے ساتھ یہ عبارت بھی درج تھی۔

"اور جو حلال طیب روزی خدا نے تم کو دی ہے اسے کھاؤ اور خدا سے جس پر ایمان رکھتے ہو، ڈرتے رہو" ۔ (سورۃ المائدہ آیت: ۸۸)

اویس کے دل میں چیمہ صاحب کے لئے احترام میں اور اضافہ ہو گیا۔ "واقعی یہ شخص فرشتہ ہے"!

اس نے سوچا۔ یکایک اس نے دیکھا کمرے میں داخل ہونے والے شخص نے اپنے بریف کیس میں سے ایک لفافہ نکال کر چیمہ صاحب کی طرف بڑھایا۔ لفافے میں سے لال لال نوٹ جھلک رہے تھے۔ چیمہ صاحب نے لفافہ دراز میں رکھتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے آپ کل آکر ڈپلیکیٹ سرٹیفکیٹ لے لیجئے گا" ۔

اویس کو یوں لگا جیسے بس میں سفر کرنے والے محمد منیر چیمہ کے نورانی چہرے کا نقاب الٹ گیا ہو۔ اور اندر سے ایک گھناؤنا چہرہ نکل آیا ہو۔ اویس کو جھٹکا سا لگا اور اُٹھ کھڑا ہوا اور لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھ سکا کہ منیر چیمہ اسے اس طرح جاتے ہوئے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

صبح کی سیر

حفیظ الرحمٰن احسن

سویرے سویرے اُٹھیں دوستو — پڑھیں سب نماز اور چلیں سیر کو
زمیں صاف ہے، آسماں صاف ہے — یہ لگتا ہے سارا جہاں صاف ہے
چمن کی فضائیں مہکتی ہیں کیا — وہ پھولوں سے شاخیں لہکتی ہیں کیا
کہیں ہے چنبیلی، کہیں ہے گلاب — ہر اک پھول کی ہے عجب آب و تاب
وہ لالہ اِدھر، اور اُدھر موتیا — ہے رنگ اس کا سرخ اور یہ ہے دودھیا!
ہوا میں ہے نرمی بھی، ٹھنڈک بھی ہے — لُبھاتی ہے آنکھوں کو ہر ایک شے
فضا صاف ستھری ہے، نکھری ہوئی — عجب تازگی سی ہے بکھری ہوئی
دکھاتے ہیں شبنم کے قطرے بہار — ہے پھولوں کے چہروں پہ ان سے نکھار
لگے ہر شجر مسکراتا ہوا — چمن کا چمن جگمگاتا ہوا!
ہر اک راستہ صاف ستھرا ہے کیا — ابھی جیسے اس کو بنایا گیا
وہ کچھ فاصلے پر ہے اک جھیل بھی — اور اس جھیل کی کشتیاں ہیں نئی
ذرا جھیل کے اس کنارے بھی آؤ — چلاتے ہیں ہم اس میں کاغذ کی ناؤ
یہ چھوٹی سی ندی بھی کیا خوب ہے — اور اس کی روانی بھی کیا خوب ہے
بہار اپنی، جھولے دکھاتے ہوئے — وہ نیچے سے اوپر کو جاتے ہوئے
کبھی بچے لگتے ہیں سہمے ہوئے — کبھی پھر خوشی سے ہُمکتے ہوئے
بلندی سے گرتی ہے اک آبشار — اُڑاتی ہوئی بوندیوں کی پھُوار
وہ پانی کا دھارا مچلتا ہوا — اُتر کر زمیں پر پھسلتا ہوا
عجب رونقیں ہیں، عجب ہے بہار — ہیں بکھرے ہوئے قہقہے بے شمار!

ملے دل کو فرحت بھی، اور خیر بھی
عجب چیز ہے صبح کی سیر بھی!

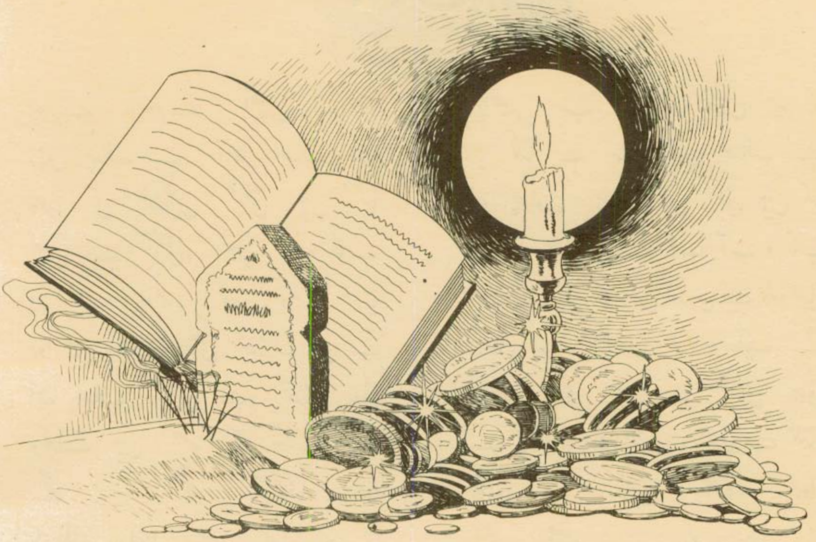

بدنصیب بیٹے

م۔ ندیم عبیگ

ایک مالدار شخص کی قبر کے کتبہ پر یہ عبارت کندہ تھی۔ "یہاں وہ شخص سو رہا ہے جس نے اپنی ساری دولت اپنے وارثوں میں تقسیم کر دی لیکن ......!!"

مجھے اس عبارت کے باقی حصہ کو جاننے... کی جستجو ہوئی اور میں نے مرحوم کے بارے میں اس بستی کے پُرانے قسم کے لوگوں سے چھان بین کی۔ بہت جستجو کے بعد ایک بزرگ نے کچھ اس طرح کا انکشاف کیا۔

"وہ شخص جس نے اپنی ذہانت اور محنت سے بہت دولت اکٹھا کر لی تھی، اب بسترِ مرگ پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ اس نے چاروں کو

باری باری سے بلایا اور کہا۔

"بیٹا تم کو میری دولت چاہئے یا ذہانت اور تجربہ، جس کے ذریعہ میں نے سب کچھ حاصل کیا ؟"

ہر اک بیٹے نے دولت کو ترجیح دی اور علم و فراست و تجربہ کو کوئی اہمیت نہ دی۔

باپ نے وصیت لکھوائی کہ اس کی دولت چاروں بیٹوں میں برابر برابر تقسیم کر دی جائے اور وہ کتاب جس میں زندگی کے تجربات اور دولت کمانے اور اس کو محفوظ رکھنے کے گُر لکھے ہیں اس کے ساتھ قبر میں دفن کر دی جائے۔

باپ کی موت کے بعد جائیداد کے حصے بخرے ہوگئے۔ چاروں بیٹوں نے دولت کو بے دریغ خرچ کیا اور عیش و عشرت میں ساری دولت کو اُڑا دیا۔" بس میں نے اس قبر کے کتبہ کی عبارت کو اس طرح مکمل کیا۔

"یہاں وہ شخص سو رہا ہے جس نے اپنی ساری دولت اپنے وارثوں میں تقسیم کر دی لیکن علم اپنے ساتھ قبر میں لے گیا۔"

اسٹوری ٹائم

ریڈیو سے ہر شام 7:50 پر

احمد فوڈ انڈسٹریز کے تعاون سے

ملک بھر کے ریڈیو اسٹیشن بچوں کے لئے پیش کرتے ہیں

کہانیوں کا ایک دلچسپ اور مزے دار سلسلہ

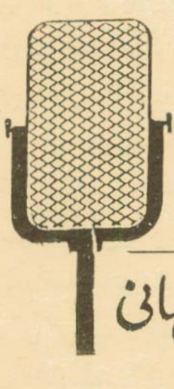

ہر شام کہانی ۔ ہر شام سہانی

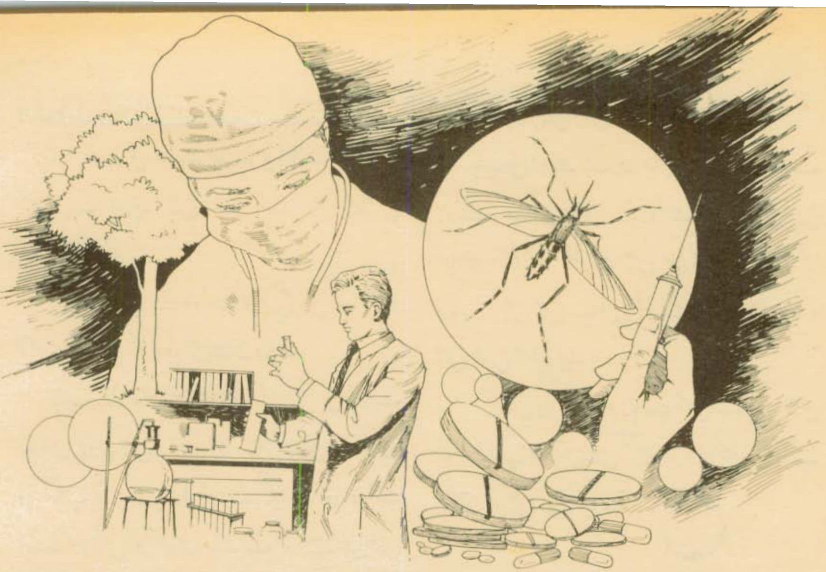

ایک ڈرامائی بیماری کی ڈرامائی دریافت

آصف وقار آصف

"ملیریا" اٹلی زبان کا لفظ ہے جو MALA اور ARIA سے مل کر بنا ہے، جس کے معنی ہیں "خراب ہوا"۔ یہ بیماری ان علاقوں میں زیادہ پائی جاتی ہے جہاں گندے پانی کے جوہڑ ہوں۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ رومی اور یونانی تہذیبوں کے زوال کی بڑی وجہ "ملیریا" ہی ہے۔ درحقیقت ملیریا ایک ایسی بیماری ہے جس نے بنی نوع انسان کو کسی بھی بیماری کے مقابلے میں سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ دو ہزار سال قدیم طبیب بھی اس سے واقف تھے اور اس کی تباہ کاریوں کا شکار تھے۔ "پلاسموڈیم ...... PLAS-MODIUM خوردبینی جرثومہ ہے۔ جس کی وجہ سے ملیریا پیدا ہوتا ہے۔ مچھر کی ایک قسم ANO-PHELES انافیلس یہ جرثومے پھیلاتے ہیں اور ملیریا کا سبب بنتے ہیں۔

"ملیریا" ایک ڈرامائی بیماری ہے۔ سب سے پہلے مریض کو سخت سردی لگتی ہے۔ بیشک اس کا درجۂ حرارت ۳۷C سے بھی زیادہ ہو؟ اس کے دانت بجنے لگتے ہیں اور کھال سخت ہو جاتی ہے۔ پھر مریض کو گرمی لگنا شروع ہو جاتی ہے اور درجۂ حرارت ۴۱C تک ہو جاتا ہے۔ سر درد اور متلی محسوس ہوتی ہے اور پسینہ بہنے لگتا ہے۔ نقاہت اور کمزوری بڑھ جاتی ہے۔ ۱۲ گھنٹے بعد وہ خود کو بہتر محسوس کرتا ہے۔ مخصوص حالتوں میں یہ تمام

علامات دوبارہ پیدا ہو جاتی ہیں اور اگر بروقت طبّی امداد نہ ملے تو مریض موت کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔ ملیریا کے حملے کئی ہفتوں تک ہر دوسرے دن جاری بھی رہ سکتے ہیں۔ ملیریا سے بچاؤ کے لئے مچھروں سے نجات حاصل کرنا لازمی ہے۔ "کونین" کی دریافت نے ملیریا کے مسئلے کو حل کرنے میں مدد دی ہے اور یہ انسانیت پر احسان عظیم کیا ہے۔

کونین کی دریافت

"کونین" کی دریافت سے "ملیریا" کو ختم کرنا آسان ہوا۔ "کونین" ایک دوائی ہے جس کی دریافت کی کوششیں سترھویں صدی سے شروع ہوئیں۔ اس زمانے میں کئی طرح کی نباتاتی اشیا دوائی کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ مثلاً "نیٹل پلانٹ" NETTLE PLANT کے کچھ حصے اور انڈے کی سفیدی کو ماتھے پر رکھ کر سردرد کا علاج کیا جاتا تھا۔

"نئی دنیا" یعنی امریکہ کی دریافت کے بعد، بہت سے گمنام پودوں کو یورپ بھیجا جاتا تھا تاکہ وہ دوائی کے طور پر استعمال ہوں۔ ایک درخت کی چھال، جس کا آبائی نام QUINA - QUINA "کینا۔ کینا" تھا، بخار کے لئے دوا مانی جاتی تھی۔ یہ بہت اچھی دوا تھی جس کی وجہ سے اس کی مانگ بہت زیادہ ہو گئی۔ بعض بد دیانت تاجروں نے "کینا کینا" سے ملتے جلتے ایک درخت سنکونا CINCHONA کی ملاوٹ شروع کر دی۔ لیکن یہ ملاوٹ بنی نوع انسان کے لئے بیش بہا نعمت ثابت ہوئی CINCHONA کی چھال ملیریا کے بچاؤ کے لئے بہترین دوا ثابت ہوئی۔ طبیبوں نے غور کیا تو پتا چلا کہ اس میں QUININE (کونین) پایا جاتا ہے۔ کونین ایک کیمیاوی مرکب ہے جو ملیریا کا مقابلہ کرنے میں مدد دیتا ہے۔ درحقیقت سترہویں صدی سے بیسویں صدی تک "کونین" ہی صرف ملیریا سے بچاؤ کی مؤثر دوا تھی۔ یوں اتفاقاً اور اچانک ہی کونین دریافت ہو گئی۔

درحقیقت "کونین" کی دریافت ایک اتفاق اور تاجروں کی بد دیانتی کا نتیجہ تھی۔ اگر QUINA - QUINA کی کمی نہ پڑتی تو کونین دریافت ہی نہ ہوتی اور انسانیت "ملیریا" کے حملوں کا شکار رہتی۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ "کونین" ہی ملیریا کا حل ہے تو بہت سے سائنس دانوں نے اسے لیبارٹری میں بنانے کی کوشش کی۔ ۱۸۵۶ء میں، ولیم ہنری پرکن نے جو صرف ۱۸ سالہ نوجوان تھا، اپنی گھریلو خام لیبارٹری میں تجربے شروع کئے۔ وہ کونین بنانے میں تو کامیاب نہ ہوا لیکن اتفاقاً ہی وہ پہلی ANILINE - DYE "انلین ڈائی" بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ ایک "مصنوعی رنگنے والا کیمیکل" ہے جو صنعتوں میں بے انتہا مقبول ہے۔ یوں کونین کی دریافت کے دوران ایک اور اہم ایجاد بھی ہو گئی۔

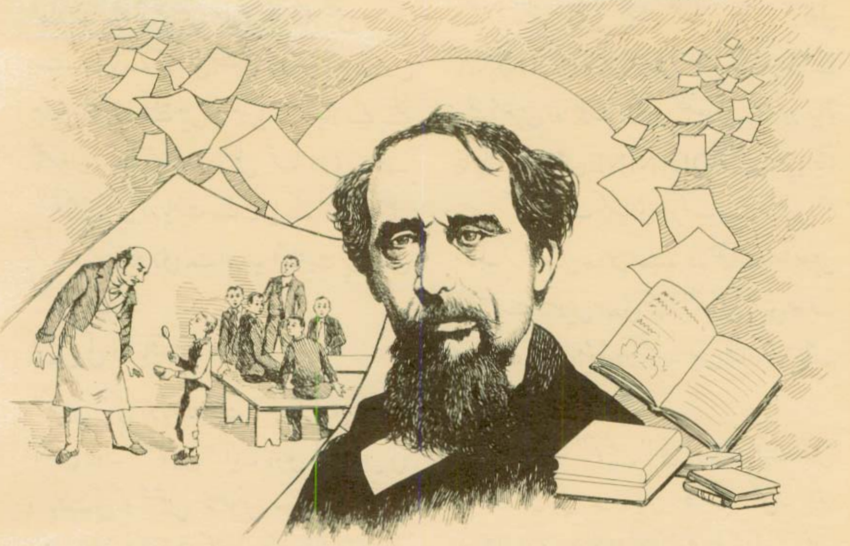

عظیم ناول نگار

چارلس ڈکنز

عابد سُلطان

کیا آپ کو علم ہے کہ بہترین مطالعہ کونسا ہے؟ عظیم لوگوں کی زندگی اور ان کے کارناموں کے بارے میں پڑھنا بہترین مطالعہ ہے۔ عظیم لوگوں کی زندگی اور کارناموں کے متعلق کتابوں کو سوانح عمری کہا جاتا ہے۔ آج ہم آپ کی دلچسپی اور معلومات کے لئے آپ کو دنیا کے عظیم ناول نگار چارلس ڈکنز کے حالاتِ زندگی کے بارے میں کچھ بتاتے ہیں۔

چارلس ڈکنز انگریزی زبان کا دنیا میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول نگار ہے۔ آپ کے اسکول کی کتابوں میں بھی ضرور اس کے کسی نہ کسی ناول سے اقتباس موجود ہو گا۔ اس کے ناول دنیا کی

ہر مہذّب زبان میں ترجمہ ہو چکے ہیں اور ساری دنیا میں پڑھے اور پسند کئے جاتے ہیں۔

ننھا ڈکنز ۱۸۱۲ء میں پورٹس ماؤتھ، انگلینڈ میں ایک غریب کلرک کے گھر میں پیدا ہوا۔ اس کا بچپن بہت غُربت میں گزرا۔ اس کے گھریلو حالات بہت خراب تھے۔ چارلس ڈکنز بہت حسّاس اور سمجھ دار بچّہ تھا۔ اسے اپنی غُربت اور بے کسی کا شدید احساس تھا۔ وہ اکثر یہی سوچا کرتا کہ ہمارے حالات کیوں اتنے خراب ہیں اور ہم دوسروں کی طرح ایک خوشحال زندگی کیوں نہیں بسر کر سکتے۔ ڈکنز کی زندگی پہلے ہی سے قابلِ رحم تھی۔ اوپر سے ایک اور مصیبت یہ آ پڑی کہ اس کے باپ پر قرض کا بوجھ اس حد تک بڑھ گیا کہ وہ اسے واپس کرنے کے قابل نہ رہا...... چنانچہ ایک مالدار شخص نے، جس کا وہ مقروض تھا، اسے قید کر لیا۔ اب چارلس ڈکنز، جس کی عمر تب صرف دس برس تھی، دنیا میں بالکل اکیلا اور بے یارومددگار رہ گیا۔ وہ کسی صاف ستھرے اسکول میں پڑھنا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس کتابوں، یونیفارم اور فیس کے لئے پیسے کہاں سے آتے۔ مجبوراً اس نے کم عمری ہی میں ایک کوئلہ خانے میں مزدوری کرنا شروع کی۔ اگرچہ یہاں اسے دن رات سخت محنت کرنا پڑتی۔ شدید سردی سے ٹھٹھرتا ہوا ننھا ڈکنز سورج نکلنے سے پہلے پہلے کوئلہ خانے جاپہنچتا۔ دن بھر کی محنت سے اس کا کمزور جسم چُور ہو جاتا۔ وہاں اس کے مالک اس کے ساتھ بہت ظالمانہ سلوک کرتے۔ اسے مارتے پیٹتے اور گالیاں بکتے۔ لیکن پھر بھی کم عمر ڈکنز وہاں کام کرتا رہا۔ کیونکہ وہاں سے اسے کم از کم اتنی رقم مل جاتی جس سے وہ اپنا پیٹ بھر سکتا۔

چارلس ڈکنز کا بچپن غربت، کسمپرسی اور شدید خراب حالات میں گزرا۔ اسے بچپن میں بہت تلخ واقعات کا سامنا کرنا پڑا اور اس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا۔ چنانچہ اس نے ان ہی مشاہدات اور تجربات کو افسانوی انداز میں اپنے ناولوں میں اتنی خوبی اور مہارت سے پیش کیا کہ جلد ہی اسے ایک عظیم ناول نگار تسلیم کیا گیا۔ اس کے ناول زندگی سے بہت قریب اور حقیقت پسندانہ ہونے کے سبب عوام میں بہت مقبول ہوئے۔ اس نے اس زمانے کے انگلستان میں رہنے والے لاکھوں غریب، مزدوروں اور کارخانوں میں کام کرنے والے محنت کشوں کی تکالیف اور مسائل کو اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ اور بے انصافی، استحصال اور ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔

ڈکنز کے اکثر ناولوں کے ہیرو کم عمر، غریب، بے آسرا اور یتیم بچّے ہوتے ہیں جن میں ان کی قابلِ رحم زندگی، ان کے مسائل اور تکالیف بہت فنکارانہ طریقے سے بیان کئے گئے ہوتے ہیں۔ ''ڈیوڈ کوپر فیلڈ'' اور ''گریٹ ایکسپیکٹیشنز'' وغیرہ اسی موضوع پر ہیں۔ انقلاب فرانس کے حوالے سے ڈکنز نے ایک بہترین کہانی ''اے ٹیل آف ٹو سٹیز'' لکھی۔ لیکن جس

جاپان کے پست قامت درخت

بڑے بڑے درخت جن کی بلندی سینکڑوں فٹ تک قدرتی طور پر ہوتی ہے، سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال عمر پاتے ہیں۔ انہیں جاپان میں پست قامت پودے کے طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ ایسے پودے شاہ بلوط (OAK) کیپل اور چلغوزے (PINE) کی اقسام تک محدود نہیں ہوتے بلکہ دیگر اقسام کے پودے بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ پودے پست قد ہونے کے باوجود اپنے تمام اجزا اور خاصیتیں برقرار رکھتے ہیں۔ ایسے پودے گملوں میں لگائے جاتے ہیں۔ ان کو پست قد رکھنے کا فن جاپانی باغبانوں نے باہر کی دنیا سے پوشیدہ رکھا ہوا ہے۔ البتہ اس حد تک معلوم ہو چکا ہے کہ بیج یا شاخ سے تیار کئے جانے والے پودوں کو پہلے ناقص اور کم گہرائی والی زمین میں کچھ عرصہ تک اُگایا جاتا ہے۔ پھر اس کی بڑھنے والی کونپلیں بار بار کاٹی جاتی ہیں۔ بعد ازاں گملوں میں منتقل کرتے وقت جڑوں کے نظام میں بھی کانٹ چھانٹ کی جاتی ہے۔ اس طرح بار بار تراش خراش کر کے ڈرائینگ رومز (DRAWING ROOMS) میں لگانے کے قابل بنایا جاتا ہے۔ ایسے تیار کئے ہوئے پودے ایک سو سال کی عمر میں چوبیس (۲۴) انچ اور ساٹھ سال عمر پانے والے پودے اٹھارہ (۱۸) انچ کی بلندی تک ہوتے ہیں۔

مرسلہ:۔ عبد الستار خان طاہر، بورے والا

کہانی سے اس کی اصلی شہرت کا آغاز ہوا وہ ہے "کرسمس کیرول"۔ یہ کہانی ۱۸۴۳ء کے کرسمس کے موقع پر چھپی اور جلد ہی اس کی ہزاروں کاپیاں بک گئیں۔ اس کتاب نے چارلس ڈکنز کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ۱۹۴۲ء میں وہ امریکہ گیا اور رنگ و نسل کے امتیاز اور غلامی کے خلاف آواز اٹھائی۔ ڈکنز نے ۱۸۳۵ء میں اس وقت کے مشہور اخبار "مارننگ کرانیکل" کے لئے رپورٹر کی حیثیت سے کام شروع کر دیا تھا اور اس کی مالی حالت رفتہ رفتہ بہتر ہو رہی تھی۔ ۱۸۴۹ء میں ڈکنز نے ایک ہفتہ وار رسالہ "ہاؤس ہولڈ ورڈز" نکالنا شروع کیا۔

چارلس ڈکنز ۱۸۷۰ء میں مر گیا اور اس کا آخری ناول "مسٹری آف ایڈون ڈروڈ" ادھورا رہ گیا۔

چارلس ڈکنز تو مر گیا لیکن اس کے ناول ہمیشہ زندہ رہیں گے جن میں اس نے غریب، بے آسرا اور مظلوم لوگوں کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا ہے۔ ان کے مسائل اور تکالیف کو اجاگر کیا ہے اور ہر ظلم اور بے انصافی کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ ساری دنیا میں ڈکنز کا شمار صفِ اوّل کے ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ اسے یہ عظمت اس لئے نصیب ہوئی کہ اس نے اپنے ناولوں کے لئے جو موضوع چُنا، اس نے خود اس ماحول کا قریب سے مشاہدہ اور تجربہ کیا تھا۔ لیکن اس ماحول میں گمنامی کی زندگی بسر کر کے مرنے کی بجائے ڈکنز نے اپنے ماحول کو فنکارانہ خوبی کے ساتھ اپنے ناولوں میں پیش کر کے اپنے نام کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا۔

کرنیں

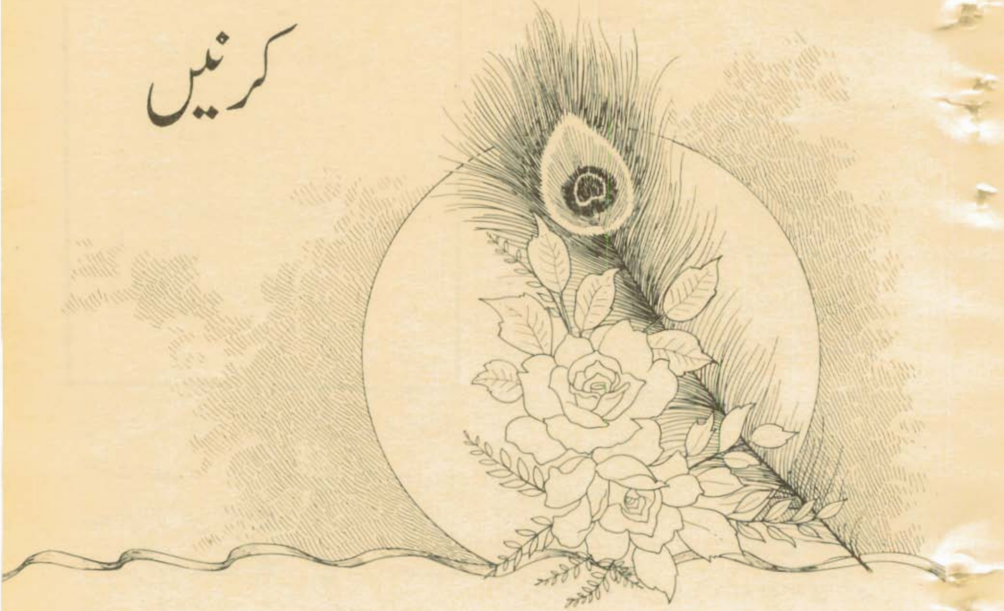

مرسلہ: محمد عثمان بن سلیم

حضرت عمرؓ جب خلیفہ بنا دیئے گئے تو ایک دن آپ نے لوگوں کو جمع کر کے ارشاد فرمایا کہ میں تجارت کیا کرتا تھا۔ اب لوگوں نے اس میں مشغول کر دیا۔ اب گزارہ کی کیا صورت ہو؟ لوگوں نے مختلف تجویزیں پیش کیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ چپ بیٹھے تھے۔ حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اعتدال کے ساتھ جو تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو کافی ہو جائے۔ حضرت عمرؓ نے اس رائے کو پسند فرمایا اور قبول کر لیا اور بیت المال سے وظیفہ مقرر ہو گیا۔

اس کے بعد ایک مرتبہ ایک مجلس میں جس میں خود حضرت علیؓ بھی تھے اور حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ شریک تھے یہ ذکر آیا کہ حضرت عمرؓ کے وظیفہ میں اضافہ کرنا چاہیے کہ گزر تنگی میں ہوتی ہے مگر ان سے عرض کرنے

زندگی

جب چوک پر لگی بتی سرخ ہوتی ہے
تو میرے کانوں میں
یہ آواز آتی ہے
باجی اخبار لو گی؟
تب میں یہ سوچتی ہوں کہ ان ننھے ہاتھوں سے
اخبار لے لوں
اور ان میں علم کی کتابیں تھما دوں۔

مرسلہ ...... فوزیہ رضا، ملتان

کی ہمّت نہ ہوئی۔ اس لئے ان کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ (جو حضورؐ کی بیوی ہونے کی وجہ سے امّ المومنین بھی تھیں) کی خدمت میں یہ حضرات تشریف لے گئے اور ان کے ذریعہ سے حضرت عمرؓ کی اجازت اور رائے معلوم کرنے کی کوشش کی اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ ہم لوگوں کے نام معلوم نہ ہوں۔ حضرت حفصہؓ نے جب حضرت عمرؓ سے اس کا تذکرہ کیا تو چہرہ پر غصے کے آثار ظاہر ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے نام دریافت کئے۔ حضرت حفصہؓ نے عرض کیا کہ پہلے آپ کی رائے معلوم ہو جائے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے ان کے نام معلوم ہو جاتے تو ان کے چہرے بدل دیتا۔ یعنی ایسی سزائیں دیتا کہ منہ پر نشان پڑ جاتے۔ "تو ہی بتا کہ حضورؐ کا عمدہ سے عمدہ لباس تیرے گھر میں کیا تھا؟" انہوں نے عرض کیا کہ دو کپڑے گیروی رنگ کے جن کو حضورؐ جمعہ کے دن یا کسی وفد سے ملاقات کی وجہ سے پہنتے تھے۔ پھر فرمایا کہ کونسا کھانا تیرے یہاں عمدہ سے عمدہ کھایا جاتا تھا۔ عرض کیا کہ جو کی روٹی۔ ہم نے گرم گرم روٹی پر گھی کے ڈبہ کی تلچھٹ الٹ کر اس کو ایک مرتبہ چپڑ دیا تو حضورؐ خود بھی اس کو مزے لے کر نوش فرماتے تھے اور دوسروں کو بھی کھلاتے تھے۔ فرمایا کہ کونسا بستر عمدہ ہوتا تھا جو تیرے یہاں بچھتا تھا۔ عرض کیا ایک موٹا سا کپڑا تھا۔ گرمی میں اس کو چوہرا کر کے بچھا لیتے تھے اور سردی میں آدھے کو اوڑھ اور آدھے کو بچھا لیتے۔ فرمایا "حفصہؓ ان لوگوں تک یہ بات پہنچا دے کہ حضورؐ نے اپنے طرز عمل سے ایک اندازہ مقرر فرمایا اور امید (آخرت) پر کفایت فرمائی۔ میں بھی حضورؐ کا اتباع کروں گا۔ میری اور میرے دو ساتھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کی مثال ان تین شخصوں کی سی ہے جو ایک راستہ پر چلے۔ پہلا شخص ایک توشہ لے کر چلا اور مقصد کو پہنچ گیا۔ دوسرے نے بھی پہلے کا اتباع کیا اور اسی کے طریقہ پر چلا وہ بھی پہلے کے پاس پہنچ گیا۔ پھر تیسرے شخص نے چلنا شروع کیا اگر وہ ان دونوں کے طریقہ پر چلے گا تو ان کے ساتھ مل جائے گا اور اگر ان کے طریقہ کے خلاف چلے گا تو کبھی بھی ان کے ساتھ نہیں مل سکے گا۔

(فضائل اعمال سے انتخاب)

بچوں کیلئے انمول تحفہ
ڈرامے، گیت، مزاحیہ خاکے خبریں، معلوماتی پروگرام اور بہت بہت کچھ
AANKH MACHOLI
VIDEO MAGAZINE
آنکھ مچولی
ویڈیو میگزین
© 1992
(P) 1992
فن کار : ظل سبحان، نگہت بٹ، قاسم عیسیٰ، جمشید انصاری، لطیف منا، نجیب اللہ انجم، شاہد اسماعیل اور بہت سے دوسرے۔
موسیقی : ارشد محمود ، پروڈیوسر: ظفر محمود شیخ ، ہدایات : سلیم مغل، اظہر نیاز !
ویڈیو میگزین
آنکھ مچولی
آج ہی طلب فرمایئے
قیمت: 150 روپے
Aankh Macholi Video Magazine
1 - PIB Colony Karachi

سبزے اور پانی سے دور بھاگنے والی "چابک دُمی" چھپکلی

سمندری مینڈک ۔ "پانی کے بغیر بھی زندگی ممکن ہے"

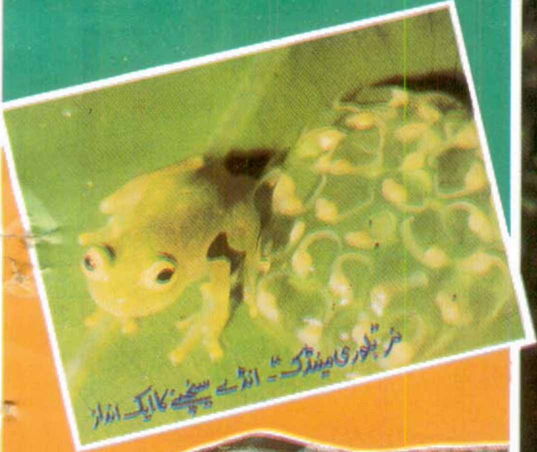

"بلوری مینڈک" ۔ انڈے سینے کا ایک انداز

آرلورل چھپکلی ۔ "ڈرائیگنوں والا چہرہ کتنا ڈراؤنا ہے"

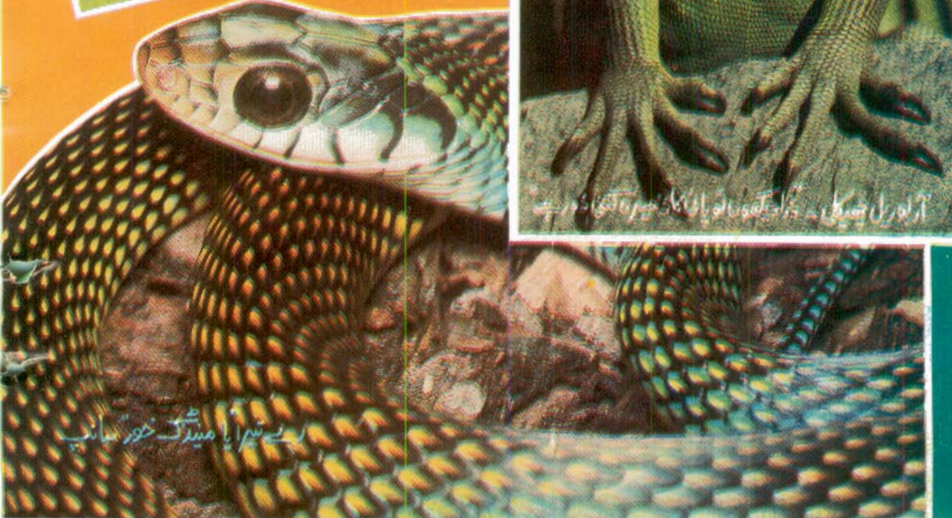

ربے شیرا یا "مینڈک خور" سانپ

یوکاتاں کے چند جانور

اخگر انوار اعوان

خلیج میکسیکو کے شمال مشرق میں سمندر کے اندر واقع جزیرہ نما یوکاتاں (Yucatan) کا نام ذہن میں آتے ہی دلچسپ جانوروں اور دیگر مخلوق کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ جزیرہ نما (Peninsula) سے مراد خشکی کا ایسا ٹکڑا جس کے تین اطراف پانی ہو اور ایک طرف خشکی کا راستہ۔ چنانچہ یوکاتاں جنوب مغربی سمت خشکی کے ذریعے گوئٹے مالا، میکسیکو اور کائپاس وغیرہ سے ملا ہوا ہے لیکن چونکہ یہ واحد راستہ بھی سطح مرتفع اور پہاڑوں پر مشتمل ہے اس لئے اس لحاظ سے انسان کے علاوہ کسی اور مخلوق کا باہر کی دنیا سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ جزیرہ نما کی اس مخصوص جغرافیائی حالت کی وجہ سے یہاں ایسے خشکی کے جانور اور جل تھلیئے (AMPHIBIANS) یعنی ایسے جانور جو خشکی اور تری دونوں پر رہتے ہیں، پائے جاتے ہیں جو مزاج کے اعتبار سے باقی جانوروں سے قدرے مختلف ہیں۔ ان کی یہاں تقریباً ۱۶۵ اقسام پائی جاتی ہیں۔

ان میں سے بعض جانوروں کو زندہ رہنے اور نسل بڑھانے کے لئے پانی یا کم از کم نمی والی آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے جانور پانی کے قریب ہی بسیرا کرتے ہیں اور پانی سے فاصلے کے لحاظ سے ان کے قد کاٹھ اور عادات میں فرق آجاتا ہے۔ پانی کے قریب کے علاقوں میں سمندری مینڈک (SEA FROG) نامی نسل کا مینڈک پایا جاتا ہے۔ جس کی لمبائی چھ سے سات انچ تک ہوتی ہے لیکن جوں جوں پانی سے دور چلے جائیں اس کا سائز کم ہونا شروع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ بہت دور علاقوں جہاں صرف نمی ہی پہنچ پاتی ہے، ایسی نسل کے مینڈک ملتے ہیں جن کا سائز ایک انچ سے بھی کم ہوتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ دلچسپ قسم بلوری مینڈک (GLASS FROG) ہے۔ اسے یہ نام غالباً اس وجہ سے ملا ہے کہ اس کا جسم نیم شفاف (TRNSPARENT) ہوتا ہے۔ بلوری مینڈک کی مادہ صرف ایسے پتوں پر انڈے دیتی ہے جن کے نیچے ندی یا پانی کا کوئی ذخیرہ موجود ہو۔ انڈے دینے کے بعد مادہ کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ اب ان کو سینا نر مینڈک کہ ذمّہ داری ہوتی ہے جو اس وقت تک ان کی نگہداشت کرتا ہے جب تک ان میں سے بچے نکل کر باحفاظت پانی میں نہ گر جائیں۔

سانپوں اور چھپکلیوں کی اگرچہ لاتعداد اقسام موجود ہیں لیکن ان کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اوّل پانی اور سبزے کے رسیا، دوئم پانی اور سبزے سے دور رہنے والے۔ چھپکلیوں میں آربوریل (ARBOREAL) نسل سے تعلق رکھنے والی چھپکلیاں دریاؤں اور درختوں یا سبزے کے قریب رہنا پسند کرتی ہیں۔ ان کی لمبائی بعض

اوقات دو فٹ سے بھی زائد ہوتی ہے۔ مرطوب ماحول میں رہنے کی وجہ سے اس کی جلد بڑی دلکش ہوتی ہے لیکن چابک دمی (WHIP - TAILED) چھپکلیاں سبزے اور نمی سے فرار کی طبیعت رکھتی ہیں۔ اگر ان کو کبھی ایسے ماحول میں رہنا پڑے تو ان کی جلد خراب ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ چٹیل میدانوں اور خشک پہاڑوں پر اپنا مسکن بناتی ہیں۔ چابک دمی چھپکلیوں کی لمبائی آربوریل چھپکلیوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور پانی سے دور رہنے کے باوجود ان کی جلد بڑی خوبصورت ہوتی ہے۔

سانپ عام طور پر پانی کے قریب رہنا پسند کرتا ہے لیکن یوکاتاں کے گارڈاکمیونو (Guarda Camino) نامی نسل سے تعلق رکھنے والے سانپ کی مجبوری ہے کہ وہ سبزے اور نمی میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ گارڈاکمیونو لاطینی زبان میں "محافظ شاہراہ" کو کہتے ہیں۔ انتہائی زہریلا یہ سانپ گزرگاہوں کے کنارے اپنا بسیرا بناتا ہے تاکہ شکار کے پاس چل کر جانے کی بجائے خود شکار اس کے پاس چل کر آئے۔ اسی طرح ٹیٹریا سانپ (Rattlesnake) بھی خشکی اور سبزے کے بغیر والی جگہوں پر ہی رہنا پسند کرتا ہے لیکن اس سے مراد یہ نہیں کہ یوکاتاں میں تمام سانپ سبزے اور نمی سے بھاگتے ہیں۔ رے نیرا (RENARA) سانپ صرف انہی علاقوں کو پسند کرتا ہے جہاں سبزہ اور پانی قریب میں موجود ہوں۔ اس کی جلد کے رنگ انتہائی خوبصورت ہوتے ہیں۔ رے نیرا سے مراد "مینڈک خور" ہے۔ یہ سانپ صرف مینڈکوں کو اپنی خوراک بناتا ہے اور بعض اوقات مینڈکوں کو سالم بھی نگل جاتا ہے۔ بلاشبہ یوکاتاں جانوروں کے لئے جنّت ہے!

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام ______

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں ______

رقم ______ بذریعہ ______

پتہ ______

______

فون نمبر ______

شہر کا ماحول

نوید ظفر کیانی

کتنا آلودہ ہمارے شہر کا ماحول ہے
تن درستی کا ہے دشمن، قابلِ لا حول ہے
گاڑیاں کیسٹ بجاتی پھر رہی ہیں ہر طرف
گویا مُردوں کو جگاتی پھر رہی ہیں ہر طرف
ہم کہیں بہرے نہ ہو جائیں مجھے تو ہول ہے
کتنا آلودہ ہمارے شہر کا ماحول ہے
جس طرف بھی دیکھتا ہوں گاڑیوں کا ہے دھواں
ایسے عالم میں ہوا ہے سانس لینا بھی گراں
لگتا ہے کہ اپنا بستر اب جہاں سے گول ہے
کتنا آلودہ ہمارے شہر کا ماحول ہے
شہر کے ماحول میں زہرِ کثافت ہے بہت
ان فضاؤں کو درختوں کی ضرورت ہے بہت
شہر خطرے میں ہیں طبّی ماہروں کا قول ہے

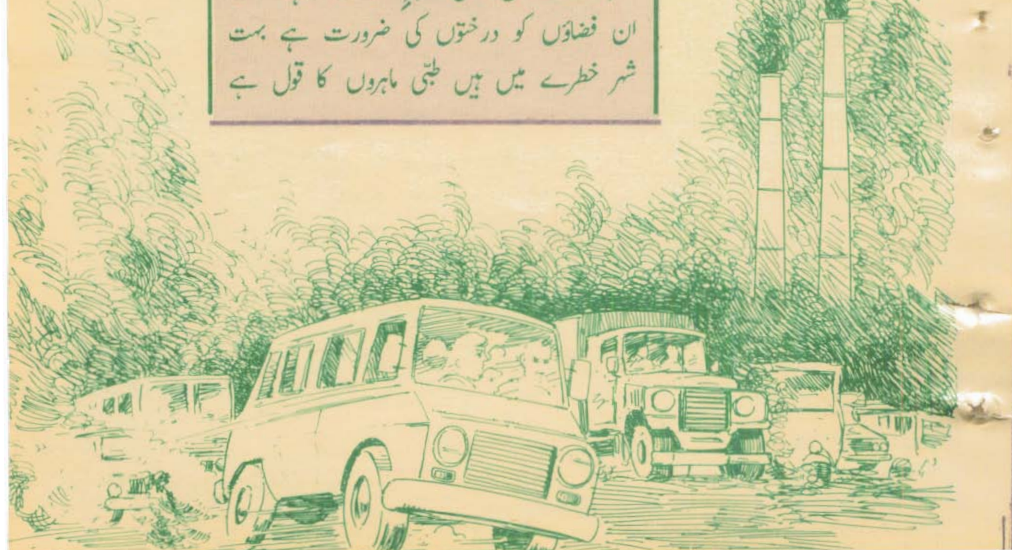

بچاؤ

بچوں کے مقبول مصنف اشتیاق احمد کے قلم سے

فاروق، محمود اور فرزانہ تینوں گھر میں اکیلے تھے۔ انسپکٹر جمشید اور ان کی بیگم کسی عزیز کی شادی کی تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ سردیوں کے دن تھے اور رات خاصی بھیگ چکی تھی۔ لوگ لحافوں کی راحت بخش گرمی میں دبکے نیند کے مزے لے رہے تھے کہ اچانک انسپکٹر جمشید کے گھر کا دروازہ دھڑدھڑایا جانے لگا۔ تینوں بہن بھائی اس اچانک افتاد سے گھبرا گئے۔ لیکن فوراً ہی انہوں نے دروازہ کھول دیا کیونکہ دستک کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت گھبراہٹ میں ہے۔ ایک زخمی شخص دروازے سے اندر داخل ہوا اور فوراً دروازہ بند کر دیا اس کے ساتھ ہی وہ بے ہوش ہو گیا۔ تینوں کی کوشش سے جب وہ ہوش میں آیا تو معلوم ہوا کہ اس کے پاس موجود بیگ میں ملک کا کوئی اہم راز ہے اور دشمن بھوکے بھیڑیوں کی طرح اس کی تلاش میں ہیں۔ بیگ کو محفوظ کر دیا گیا۔ اسی وقت دوبارہ دروازہ دھڑدھڑانے کی آواز آئی۔ اور جب تھوڑی دیر تک کسی نے دروازہ نہ کھولا تو باہر موجود افراد نے اسے توڑ ڈالا۔ ایک پٹ ذرا سا کھلا اور اس میں سے کلاشن کوف کی نال جھانکنے لگی۔

وہ دس مسلح افراد تھے۔ انہوں نے آتے ہی محمود، فاروق اور فرزانہ کے ہاتھ پیر رسیّوں میں باندھے اور ایک کمرے سے زخمی شخص کو بھی تلاش کر لائے۔ ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ زخمی شخص ملک کے مایہ ناز سائنس دان پروفیسر عمران جاہ ہیں جو انشار جہ میں ایک ریسرچ سینٹر سے کوئی خطرناک فارمولا اُڑا کر اپنے ملک لائے ہیں مگر عین وقت پر اس چوری کا علم ہو جانے کے باعث کچھ لوگ انشار جہ سے ہی ان کے تعاقب میں تھے اور بالآخر انہیں پکڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ محمود وغیرہ دشمنوں کو باتوں میں لگا کر وقت ضائع کر رہے تھے اور انتظار میں تھے کہ باہر سے کوئی مدد آجائے۔ مگر دشمن بھی چالاک تھے۔ ان کی چال سمجھ گئے اور تشدّد پر اتر آئے۔ بانکے نامی ایک بدمعاش نے جب خنجر سے فاروق کے کان کی لو کاٹنے کی کوشش کی تو فرزانہ نے چیخ کر اُس بیگ کا پتا بتانے کا وعدہ کر لیا جس میں اہم راز پوشیدہ تھا۔

فرزانہ کا وعدہ بھی دراصل ایک چال ہی تھی۔ اس بہانے اس نے اپنے ہاتھ پاؤں کھُلوا لئے اور اسٹور روم سے پرانے کھلونوں کا ایک کچرا بیگ لا کر ان کے حوالے کر دیا۔ جس وقت بدمعاش اس بیگ سے اُلجھے ہوئے تھے۔ فرزانہ موقع پاتے ہی وہاں سے غائب ہو گئی۔ بدمعاش اس کی تلاش میں سارے گھر میں پھیل گئے مگر فرزانہ کا کہیں پتا نہ چلا۔ اسی اثنا میں پولیس فورس ان کی مدد کے لئے پہنچ چکی تھی جس کو بیگم شیرازی نے فون کیا تھا۔ انسپکٹر اکرام نے آتے ہی تمام بدمعاشوں کو باندھ لیا۔ پروفیسر عمران جاہ اس اچانک کامیابی پر بہت خوش ہو رہے تھے۔ انہیں یقین ہو چلا تھا کہ ان کی محنت ٹھکانے لگنے والی ہے۔ بظاہر وہ لوگ بازی جیت چکے تھے لیکن یہ کھیل اس وقت بالکل اُلٹ ہو گیا جب فوج کی وردی میں دشمن کے آدمی وہاں آئے۔ انسپکٹر اکرام اور محمود وغیرہ انہیں پہچان نہ سکے اور اصل صورتِ حال ان کے سامنے بیان کر دی۔ فرزانہ ابھی تک غائب تھی۔ فوج کے میجر سلمان دارانے مسکراتے ہوئے حکم دیا کہ اپنے ساتھیوں کو کھول دیا جائے اور انسپکٹر اکرام، محمود، فاروق اور پروفیسر عمران جاہ کو گرفتار کر لیا جائے۔ سب لوگ حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔

اب آپ آگے پڑھیے

آن کی آن میں انہیں اور سب انسپکٹر اکرام کے ماتحتوں کو زد پر لے لیا گیا۔

"اب بتاؤ...... وہ لڑکی کہاں ہے؟"

"ہم خود اسے تلاش کر رہے ہیں۔"

"تم ڈرامہ کر رہے تھے...... میں تم لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"ایک تو یہ بہت بھاری مصیبت ہے...... سب ہمیں اچھی طرح جانتے ہیں۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنایا۔ جواب میں فاروق کو منہ پر ایک زور دار طمانچہ لگا۔

"میں اِدھر اُدھر کی باتیں پسند نہیں کرتا...... صرف اور صرف یہ بتاؤ...... تمہاری بہن کہاں ہے؟"

"ہمیں نہیں معلوم۔" محمود نے کہا۔ جواب میں اس کے منہ پر بھی طمانچہ لگا۔

"آپ کو ان طمانچوں کا جواب دینا پڑے گا۔" محمود غُرّایا۔

"یہ لو جواب......" اس کے دوسرے گال پر بھی تھپّڑ پڑا۔

"انکل...... آپ دیکھ رہے ہیں ہمارے

ساتھ کیا ہو رہا ہے؟"

"ہاں! دیکھ رہا ہوں ...... یہ نقلی فوجی ہیں ...... راجو چوڑی کے ساتھی۔"

"جی ہاں! ان لوگوں نے بہت زبردست چال چلی تھی۔"

"میں کہتا ہوں ...... وہ لڑکی کہاں ہے؟"

"وہ اب یہاں کہاں ...... پتا نہیں کہاں پہنچ چکی ہو گی اس وقت تک۔"

"نہیں ...... وہ یہیں کہیں ہے۔" نقلی میجر مسکرایا۔

"کیا مطلب ...... یہ بات آپ اتنے یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہیں؟"

"سنو پھر ...... تم دراصل ابھی بچے ہو ...... ہم نے سب سے پہلے تمہارے گھر کو گھیرے میں لیا تھا۔ کیونکہ ہم تمہاری چالاکیوں سے بہت اچھی طرح واقف ہیں ...... پھر ہم نے استاد راجو چوڑی کو اس کے نو ساتھیوں کے ساتھ اندر بھیجا ...... ہم جانتے تھے، وہ تم سے بیگ حاصل نہیں کر سکیں گے ...... یہی ہوا ...... ان کے قابو میں آ جانے کے بعد ہمارے خیال کے مطابق تمہاری بہن کو تم تک پہنچ جانا چاہئے تھا ...... ہم اس انتظار میں رہے ...... لیکن جب تم اسے آوازیں دے کر تھک گئے تو ہم نے جان لیا کہ وہ لڑکی اس سے کہیں زیادہ چالاک ہے، جتنا کہ ہم خیال کرتے رہے ہیں اور یہ کہ وہ ابھی نہیں آئے گی۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ انسپکٹر جمشید یہاں پہنچ جائیں ...... ہم نے سوچا ...... ہمیں خود اسے تلاش کرنا چاہئے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا ...... اب پروفیسر عمران جاہ کی حیرت دیکھنے کے قابل تھی۔

"میں ...... میں ایک بار پھر اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں اور تم لوگوں سے معافی مانگتا ہوں۔"

"نہیں پروفیسر صاحب ...... ابھی فرزانہ یہاں نہیں ہے ......" فاروق بولا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"مطلب یہ کہ اس کی عدم موجودگی میں ہم الفاظ واپس کس طرح دے سکتے ہیں۔"

"خاموش! ...... صورتِ حال اس وقت پوری طرح ہمارے قابو میں ہے ...... تم جاؤ ...... اور اس لڑکی کو فوراً تلاش کرو ...... دیکھو، دیر نہ لگے ...... ورنہ کام خراب ہو سکتا ہے۔"

"اوکے سر۔" کئی آوازیں ایک ساتھ اُبھریں۔

اس کے ساتھی چلے گئے ...... صرف تین ساتھی اس کے ساتھ رہ گئے۔

"اب یہ پائیں باغ کا چپہ چپہ چھان ماریں گے اور گھر کا بھی ...... فرزانہ جہاں بھی ہو گی ...... ضرور مل جائے گی۔" میجر بولا۔

"حیرت ہے ...... آپ تو اس کا نام بھی جانتے ہیں!" اس کے ایک ماتحت نے کہا۔

"ان لوگوں کے نام اور ہم نہ جانیں!"

"اس بیگ میں کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"خاموش...... بیگ کی بات نہ کرو...... صرف بیگ حاصل کرو...... یہی حکم ہے ہمیں۔"

"بیگ نہ ہوا...... ہوّا ہو گیا......" فاروق نے منہ بنایا۔

"آپ کا کیا خیال ہے...... ہمارے ساتھی اس لڑکی کو تلاش کر لیں گے؟"

"ہاں! زیادہ امکان اسی بات کا ہے...... ظاہر ہے...... پائیں باغ کے کسی درخت پر ہو گی اور کہاں جائے گی؟"

محمود، فاروق، اکرام اور پروفیسر عمران جاہ کے رنگ اُڑے اُڑے تھے...... بیگم شیرازی، ان کی پڑوسی، بھی کم پریشان نہیں تھیں...... ان کے دل دھک دھک کر رہے تھے کہ کہیں فرزانہ انہیں مل نہ جائے...... وہ دل ہی دل میں زور و شور سے اللہ سے دعائیں کرنے لگے۔

پندرہ منٹ اور گزر گئے...... میجر کے چہرے پر الجھن اور غصّے کے آثار نظر آنے لگے۔ آخر اس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا...... وہ باہر نکل کر چلاّیا۔

"تم لوگ اب تک ایک لڑکی کو تلاش نہیں کر سکے!!"

"وہ یہاں کہیں نہیں ہے سر۔" کسی نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میجر بولا۔

"ہم ایک ایک چپہ دیکھ رہے ہیں سر۔"

"اپنی تلاش جلد مکمل کرو...... اب انسپکٹر جمشید کے آنے میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔"

"آپ کو کیسے پتا؟"

"ہم یہاں ہونے والی ساری گفتگو سنتے رہے ہیں...... وہ دس بجے کے قریب آئیں گے۔"

محمود اور فاروق نے فوراً گھڑیوں کی طرف دیکھا...... صرف پندرہ منٹ باقی تھے۔ ایک بار پھر وہ دُعائیں کرنے لگے۔ ایسے میں میجر زور سے اُچھلا۔

"ارے...... یہ کیا!"

"کیا ہوا سر؟" اس کے ایک ماتحت نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں نے اس لڑکی کو تلاش کر لیا ہے...... سب کو بلالو...... نصف آدمی مکان کے باہر نگرانی کریں اور نصف یہاں آجائیں...... جو لوگ باہر ٹھہریں...... انہیں ہدایت دیں...... انسپکٹر جمشید آتے نظر آئیں تو انہیں گولیوں کا نشانہ بنا دیا جائے۔"

"اوکے سر...... لیکن ابھی ابھی آپ نے کہا ہے...... کہ آپ نے اس لڑکی کو تلاش کر لیا ہے...... تو وہ کہاں ہے ہمیں تو کہیں نظر نہیں آئی۔"

"تم آنکھوں سے پیدل ہونا! اس لئے

...... جاؤ جلدی کرو، جو کہنا ہے پہلے وہ کرو۔" اس کا ماتحت فوراً باہر نکل گیا ......

پانچ منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی ...... دس کے قریب نقلی فوجی اس کے ساتھ اندر آ گئے۔

"سب انتظام ہو گیا سر ...... انسپکٹر جمشید آئے تو انہیں گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔"

"ہاں ٹھیک ہے ...... فوجی وردیوں میں ہمارے ساتھیوں کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکے گا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

"لیکن وہ لڑکی کہاں ہے سر؟"

"وہ ...... اس مسہری کے نیچے ہے ...... جس پر پروفیسر عمران جاہ لیٹے ہوئے ہیں۔"

"کیا!! ...... نہیں!!" محمود، فاروق اور سب چلائے۔

پروفیسر عمران جاہ کا منہ مارے حیرت کے کھل گیا ...... ساتھ ہی فرزانہ مسہری کے نیچے سے نکل آئی۔

"کک ...... کمال ہے ......" پروفیسر صاحب ہکلائے۔

"لیکن اب یہ کمال سارا دھرا کا دھرا رہ گیا۔"

"نہیں جناب، مشکل ہے ...... کمال میں یہ کمال ہو ہی نہیں سکتا کہ دھرا کا دھرا رہ جائے۔" فاروق نے کہا۔

"چالاک لڑکی ...... اب بتاؤ ...... بیگ میں سے جو چیز نکلی، وہ کہاں ہے؟"

"مسہری کے نیچے دیکھ لیں۔" فرزانہ نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"بتاتی ہوں یا ......" اس نے گویا دھمکی دی۔

"یا آپ کیا کر لیں گے؟"

"سر! آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ یہ مسہری کے نیچے ہے؟" میجر کے ایک ساتھی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پہلے ان لوگوں کا خیال تھا کہ ان کی بہن پائیں باغ میں چھپی ہے لیکن جب یہ اسے آوازیں دے چکے تو پھر انہیں اندر آنے کے بعد مسہری کا خیال آیا ...... میں نے کئی بار انہیں کن اکھیوں سے مسہری کی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔"

"محمود، فاروق ...... مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔" فرزانہ نے انہیں گھورا۔

"ہم صرف یہ یقین کرنا چاہتے تھے کہ تم مسہری کے نیچے ہو یا نہیں ...... یہ ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ یہ حضرت بھانپ لیں گے۔" محمود بولا۔

"۔ خیر کوئی بات نہیں۔" فرزانہ مسکرائی۔

"اس سے پہلے کہ انسپکٹر جمشید یہاں پہنچیں ہمیں ان سے وہ چیز حاصل کر کے یہاں سے نکل جانا چاہئے ...... اور جانے سے پہلے ......" میجر کہتے کہتے رک گیا۔ اس کا لہجہ سفاک ہو گیا تھا۔

"جانے سے پہلے کیا سر؟"

"جانے سے پہلے پروفیسر عمران جاہ کا جسم ضرور چھانی کرنا ہے...... سارے فساد کی جڑ تو یہی ہیں نا!" یہ کہہ کر وہ فرزانہ کی طرف مڑا۔

"ہاں لڑکی...... بیگ سے نکالی گئی چیز کہاں ہے؟"

"پروفیسر صاحب! کیا میں انہیں بتا دوں؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ بولے۔

"تم نے سنا، ہمیں ہرگز نہ بتانے کی ہدایت ملی ہے۔"

"یہ ایسے نہیں مانیں گے...... تین تک گنوں گا...... تین پر بھی نہ بولیں تو انہیں گولیاں مار دینا اگر تم نے گولیاں نہ چلائیں تو پھر مجھ سے بُرا تم لوگوں کے لیے کوئی نہ ہو گا۔" میجر نے غُرّا کر کہا اور بولا۔

"ایک!" ایک کے ساتھ ہی سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

محمود، فاروق اور فرزانہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ چاروں طرف سے کلاشن کوفوں اور پستولوں کی زد میں تھے۔

"دو!" میجر کی سرسراتی آواز ان کے کانوں میں گھُسی...... انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، جیسے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"تین!" میجر نے یک دم کہا۔

ٹریگروں پر انگلیاں دباؤ ڈالنے لگیں۔ ایسے میں فرزانہ نے ڈھیلی ڈھالی آواز میں کہا۔

"وہ چیز مسہری کے نیچے ہے۔"

"کیا!...... نہیں!" وہ ایک ساتھ بولے۔

"اگر یقین نہیں تو نکال کر دیکھ لیں۔" فرزانہ بولی۔

"دیکھو...... مسہری کے نیچے۔" میجر نے ایک ساتھی کو حکم دیا۔ وہ مسہری کے نیچے رینگ گیا۔ اور پھر جب وہ باہر نکلا تو اس کے ساتھ فرش پر سرکتا ہوا ایک پیکٹ نکلا۔ اخبارات میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ۔

"ن...... نہیں نہیں...... میری اتنی زبردست محنت پر پانی نہیں پھر سکتا۔" پروفیسر عمران جاہ جیسے نیند کے عالم میں بولے۔

"پانی تو کب کا پھر چکا ہے پروفیسر...... تم نے فرار کے لئے دُرست منصوبہ بندی نہیں کی...... ہم لوگ تمہارے پیچھے لگ گئے اور یہاں تک چلے آئے۔"

"لیکن سر...... یہ پیکٹ بھی تو ان شیطان کے چیلوں کی چال ہو سکتا ہے۔" ایک ساتھی بولا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"ہو سکتا ہے۔ یہ وہ پیکٹ نہ ہو...... بلکہ ان کا تیار کردہ مصنوعی پیکٹ ہو۔"

"اچھا خیال ہے...... ہم اس پیکٹ کو چیک کر کے ہی یہاں سے لے جائیں گے۔ ان کی کوئی چالاکی نہیں چلنے دیں گے۔" میجر نے کہا۔

"تو کیا میں اس کو کھول ڈالوں سر؟"

"ہاں کھولنا تو ہو گا ہی۔"

حیرت انگیز

☆ جنوب مشرقی ایشیا کے ملک برونائی کے قانون کے تحت جمعہ کے دن نمازِ جمعہ کے لئے جامع مسجد میں نہ آنا جرم ہے۔

☆ جزیرہ انڈیمان میں تین سال تک شراب بطور کرنسی استعمال ہوتی رہی تھی۔

☆ اٹھارویں صدی کے آخر میں چین میں "شین شنات" نامی شخص کا جسم اس قدر شفاف تھا کہ اندرونی اعضا بخوبی نظر آتے تھے۔

☆ مشہور سائنس دان "نیوٹن" اپنی زندگی میں صرف ایک بار تھیٹر گیا اور وہ بھی آدھا ڈرامہ چھوڑ کر واپس آگیا۔

☆ امریکہ میں سائنس دانوں نے پیاز کی ایک ایسی قسم لگائی ہے جسے کاٹتے وقت آنکھوں سے آنسو نہیں نکلتے۔

☆ ہالی وڈ میں کسی شادی کا مسلسل ایک سال تک قائم رہنا ایک اہم خبر سمجھی جاتی ہے۔

☆ کرکٹ کے مشہور پاکستانی کھلاڑی "صادق محمد" نے ۲۹ مئی ۱۹۷۵ء کو انگلستان میں کھیلے گئے ایک میچ کے ۱۱۱ویں منٹ میں ۱۱۱ویں گیند پر ۱۱۱ رنز بنائے۔

مرسلہ:۔ نثار احمد ہاشمی کراچی

"اوہو ...... پروفیسر صاحب کی طبیعت شاید خراب ہو رہی ہے۔ طبیعت کی بحالی کے لئے انہیں ایک گولی کھلا دوں۔" محمود نے چونک کر کہا اور ان کی طرف لپکا۔

"خبردار ...... وہیں کھڑے رہو۔" ایک گرجا۔

لیکن اس وقت تک محمود پروفیسر عمران تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے آن کی آن میں گولی ان کے منہ میں ڈال دی۔

"ارے ارے ...... میں ٹھیک ہوں ...... مجھے کسی گولی کی ضرورت نہیں۔"

"پھر بھی آپ اسے نگل لیں یا چبا ڈالیں طاقت بحال ہوگی آپ کی۔" محمود نے کہا۔

"اوہو اچھا ...... پھر تو ایک ایک گولی ہمیں بھی دیں۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"یہ کوئی کھیل کھیل رہے ہیں سر۔" میجر کے ایک ساتھی نے اسے خبردار کیا۔

"ہاں! گولیوں کا کھیل ......" ان الفاظ کے ساتھ ہی محمود نے ایک ایک گولی ان کے منہ کا نشانہ لے کر اچھال دی۔ گولیاں فرزانہ، فاروق، اکرام اور بیگم شیرازی کے منہ میں سیدھی گئیں۔ ساتھ ہی محمود نے بھی ایک گولی کھالی۔

"اب ہم آپ کی نظروں سے اوجھل ہو رہے ہیں جناب۔" محمود مسکرایا۔

"کیا مطلب؟"

"یہ جو ہم نے گولیاں کھائی ہیں نا ...... یہ جادو کی ہیں ...... یہ دیکھئے ...... ہم گئے۔"

عین اسی وقت پیکٹ کھل گیا ...... ایک دھماکہ ہوا اور کمرے میں دھواں بھر گیا۔

(پھر کیا ہوا؟ آئندہ پڑھئے)

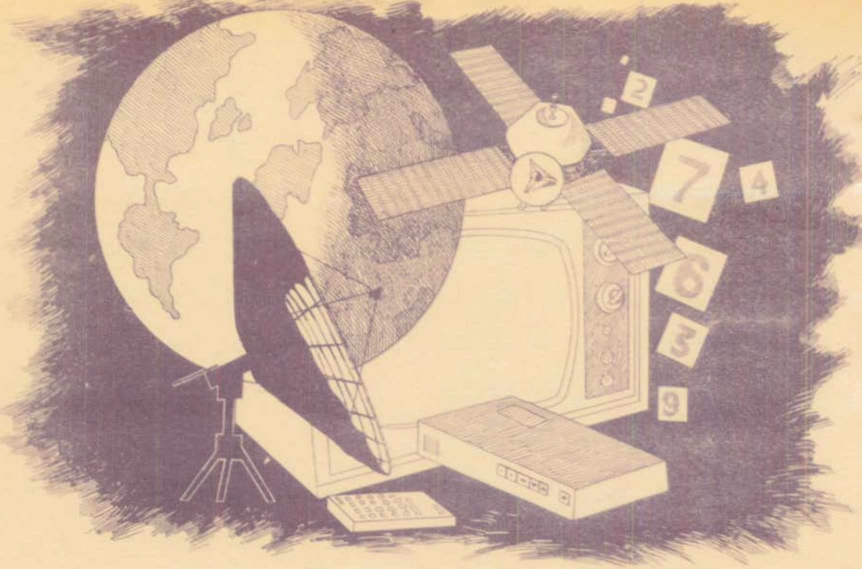

ڈش انٹینا کیسے کام کرتا ہے؟

حسن فرخ

آج کل دو نام سب سے زیادہ سُننے میں آ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک مصنوعی سیارہ (SATLI-TE) ہے۔ اس کے علاوہ آج کل کئی گھروں اور دفتروں کے اوپر ایک توا نما چیز جسے ڈش انٹینا (DISH ANTENNA) کہتے ہیں، بہت دیکھنے میں آرہی ہے۔ اس ڈش انٹینا سے مصنوعی سیارے کی نشریات وصول کی جا سکتی ہیں۔ ان دونوں چیزوں کے ناموں سے تو ہم سب ہی واقف ہیں اور ہم میں سے کئی لوگوں نے انہیں دیکھا بھی ہو گا لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مصنوعی سیارہ کیا ہے؟ ہمیں اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اور اس کے ذریعے آنے والی نشریات عام انٹینا سے کیوں نہیں دیکھی جا سکتیں؟

دراصل مصنوعی سیارہ ایک ایسا آلہ یا مشین ہے۔ جسے راکٹ کے ذریعے خلا میں بھیج دیا جاتا ہے اور پھر زمین سے اسے مختلف قسم کی نشریات،

جن میں ٹیلی ویژن، ریڈیو اور ٹیلی فون وغیرہ کی نشریات شامل ہیں، بھیجی جاتی ہیں جنہیں مصنوعی سیارہ زمین کی دوسری طرف منتقل کر دیتا ہے۔ اب ہم اپنے دوسرے سوال کی طرف آتے ہیں کہ آخر ہمیں اسکی ضرورت کیا ہے؟ تو اصل میں بات یہ ہے کہ جو نشریات ہم عام ٹیلی ویژن اسٹیشن یا کسی اور اسٹیشن سے نشر کرتے ہیں، انہیں ہم ایک خاص فاصلے تک وصول کر سکتے ہیں جس کے بعد یہ نشریات یا سگنل خلا کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اب یہ خلا کی طرف کیوں جاتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام نشریات چاہے وہ ٹیلی ویژن یا ریڈیو کی ہوں، یا پھر کسی اور چیز کی، یہ تمام دراصل برقی لہروں کی شکل میں نشر ہوتی ہیں۔ یہ برقی لہریں بالکل ایک سیدھی لکیر کی صورت میں سفر کرتی ہیں اور اس طرح یہ لہریں سفر کرتی ہوئی سیدھی خلا کی طرف نکل جاتی ہیں۔

اس لئے ہم وہ نشریات جنہیں دور دراز علاقے تک بھیجنا ہوتا ہے، مصنوعی سیارے کو بھیجتے ہیں جو ایک خود کار نظام کے ذریعے ان نشریات کو دوسری طرف منتقل کر دیتا ہے۔

دنیا کا سب سے پہلا مصنوعی سیارہ روس نے ۱۹۵۷ء میں بھیجا تھا۔ مصنوعی سیاروں سے اب مختلف نوعیت کے کام لئے جاتے ہیں۔ مثلاً ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی نشریات کے علاوہ ہم ٹیلی فون پر ایک ملک سے دوسرے ملک بات کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مصنوعی سیارے سے زمین کی مختلف تصاویر لی جاتی ہیں جن کی مدد سے ہم موسم کی پیش گوئی کر سکتے ہیں اور اسی قسم کی تصاویر حاصل کر کے فوج، دشمن کے ٹھکانوں کا بھی پتا لگاتی ہے۔ مصنوعی سیارے سے جاسوسی کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ مصنوعی سیارے کو کم از کم ایک سو پچاس کلو میٹر کی بُلندی پر چھوڑا جاتا ہے لیکن انہیں دیر تک کار آمد بنانے کے لئے زیادہ اونچائی تک لے جایا جاتا ہے۔ ایسے مصنوعی سیارے جن سے ہم ٹیلی ویژن کی نشریات حاصل کرتے ہیں وہ تقریباً ۲۴۰۰۰ کلو میٹر کی بُلندی پر ہوتے ہیں۔ اب تک پاکستان بھی دو مصنوعی سیارے بدر اوّل اور بدرِ دوئم بنا چکا ہے، جن میں سے بدرِ اوّل کو خلا میں چھوڑا بھی جا چکا ہے۔ اور اب حال ہی میں پاکستان نے اپنا پہلا سٹلائٹ چینل (SATLITE CHANEL) "پی ٹی وی ٹو" کے نام سے شروع کیا ہے۔

یہ تو تھیں کچھ معلومات مصنوعی سیارے کے متعلق اور اب آتے ہیں ڈش انٹینا کی طرف کہ ہمیں مصنوعی سیارے کی نشریات وصول کرنے کے لئے ڈش انٹینا کیوں لگانا پڑتا ہے؟

اصل میں بات یہ ہے کہ یہ نشریات ویسے تو عام ٹی وی انٹینا سے بھی وصول کی جا سکتی ہیں لیکن کیونکہ یہ نشریات کافی بُلندی (تقریباً ۲۴۰۰۰ کلو میٹر) سے ہم تک آتی ہیں اس لئے یہ کافی حد تک کمزور ہو جاتی ہیں لہٰذا انہیں دیکھنے یا سُننے کے لئے ہمیں انہیں دوبارہ طاقتور بنانا پڑتا ہے۔ اس کے لئے ہم ڈش استعمال کرتے ہیں کیونکہ جب وہ کمزور

نشریاتی لہریں ڈش سے ٹکراتی ہیں تو منعکس (-REF
LECT) ہو کر ایک خاص پوائنٹ سے گزرتی ہیں جسے نقطۂ ماسکہ یا (FOCUS) کہا جاتا ہے۔ اس پر ایک اسکوپ لگائی جاتی ہے، جس سے ایک تار ٹی وی سیٹ کے پاس رکھے ایک اور سیٹ تک جاتی ہے جسے عام طور پر ریسیور (RECIEVER) کہتے ہیں۔ اس ریسیور کا اصل کام یہ ہوتا ہے کہ اسکوپ پر جمع ہونے والے سگنل کو ایمپلیفائر (-AMPLIPHI RE) کے ذریعے اس قدر طاقت ور بنا دیتا ہے کہ اسے ٹیلی ویژن پر دیکھا جا سکے۔

اس کے علاوہ ڈشیں مختلف سائزوں کی ہوتی ہیں۔ ان کا سائز زمین سے مصنوعی سیارے کے فاصلے کے مطابق ہوتا ہے۔ پاکستان میں تین مصنوعی سیاروں کی نشریات آتی ہیں جن میں ایشیا سیٹ، عرب سیٹ اور یورپین سیٹ شامل ہیں۔ ایشیا سیٹ کے لئے چار سے چھ فٹ کی ڈش چاہئے ہوتی ہے۔ پاکستانی چینل کی نشریات ہم تک ایشیا سیٹ سے پہنچتی ہیں۔

یہاں میں آپ کو مصنوعی سیارے کے متعلق چند اور معلومات بتاتا چلوں کہ اسے کم از کم ۱۵۰ کلو میٹر کی اونچائی پر چھوڑا جاسکتا ہے لیکن اتنی اونچائی پر چھوڑے جانے والا مصنوعی سیارہ خلا میں ایک جگہ ساکن نہیں رہتا بلکہ یہ زمین کے گرد مسلسل چکر لگاتا رہتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہم ایک ہی مصنوعی سیارے سے ہر نوّے منٹ بعد زمین کے متعلق کئی اہم معلومات حاصل کر سکتے ہیں، نوّے (۹۰) منٹ بعد اس لئے کہ یہ زمین کے گرد اپنے مدار میں نوّے منٹ میں ایک چکر مکمل کرتا ہے لیکن ٹیلی ویژن، ریڈیو جیسی نشریات کے لئے ہمیں ایسے مصنوعی سیارے چاہئے ہوتے ہیں جو خلا میں ایک جگہ کھڑے رہیں۔ لہٰذا مصنوعی سیارے جن سے ہمیں ایسی نشریات حاصل کرنی ہوتی ہیں انہیں ۲۰،۰۰۰ سے ۲۴،۰۰۰ کلو میٹر کی اونچائی تک بھیجا جاتا ہے۔

ورلڈ کپ جیسے براہِ راست پروگرام ان ہی مصنوعی سیاروں سے وصول ہوتے ہیں۔

ماں کی عظمت

۱۔ سخت سے سخت دل کو ماں کی پُر نم آنکھوں سے موم کیا جا سکتا ہے۔

(علامہ اقبالؒ)

۲۔ اگر مجھے میری ماں سے جدا کر دیا جائے تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔

(حکیم لقمان)

۳۔ ماں کے بغیر گھر قبرستان کی طرح لگتا ہے۔

(اورنگزیب عالمگیر)

۴۔ ماں اور پھول میں مجھے فرق نظر نہیں آتا۔

(نادر شاہ)

۵۔ ماں کی محبت حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

(الطاف حسین حالی)۔

چمکیلی

نعیم مشتاق نومی

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ ایک سنہری مچھلی تھی۔ پیاری سی، بھولی بھالی اور خوبصورت سی۔ اس کے سنہری رنگ کی وجہ سے سب اسے "چمکیلی" کہتے تھے۔

چمکیلی ایک بہت بڑے گلاس ٹینک میں رہتی تھی۔

سارا دن وہ پانی سے بھرے شیشے کے ٹینک میں اِدھر اُدھر تیرتی رہتی اور پانی میں اگی ہوئی گھاس پھونس سے کھیلتی رہتی۔ وہ اپنی پانی کی دنیا میں بہت خوش تھی۔ بہت ہی خوش۔ مگر ایک دن ہوا یوں کہ......

اس پانی کے گلاس ٹینک کے قریب ایک

درخت پہ ایک خوبصورت پرندہ آ بیٹھا۔ اور اپنی خوبصورت، سریلی آواز میں گانے لگا۔ وہ گانا بھی بہت خوبصورت تھا۔

وہ خوبصورت پرندہ، خوبصورت آواز اور خوبصورت گانا سن کر چمکیلی اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ بالکل اسی طرح جس طرح لوگ اسے دیکھ کر مبہوت رہ جاتے تھے کہ اتنی خوبصورت اور چمکدار مچھلی!

"کاش میں ایک پرندہ ہوتی!۔" چمکیلی نے حسرت سے سوچا۔ "میں پرندہ ہوتی تو اس پرانے، پانی کے ٹینک میں ادھر ادھر تیرنے کی بجائے دنیا میں ادھر ادھر گھومتی پھرتی، ...... مزے سے ہوا میں اڑتی ...... ہائے، کتنا مزاہ آتا ہو گا اڑنے کا!...... کاش میں اس پرندے کی طرح چھوٹا سا، خوبصورت سا پرندہ ہوتی!......"

وہ سوچ میں ڈوبی آہستہ آہستہ پانی میں اوپر نیچے تیر رہی تھی۔ اور بہت افسردہ تھی۔ اسی وقت ایک چھوٹا سا کتا وہاں سے "بھوں بھوں" کرتا ہوا گزرا۔ وہ "پپّی" تھا۔

"پپّی" ایک لڑکے "بلو" کا کتا تھا۔ جو قریب ہی کہیں رہتا تھا۔ چونکہ وہ پارک تھا۔ اس لئے وہ دونوں وہاں آکر کھیلا کرتے تھے۔

"بلو" ایک گیند کو زور سے آگے کی طرح پھینکتا۔ "پپّی" تیزی سے اس کے پیچھے لپکتا اور چند لمحوں میں گیند کو جالیتا۔ پھر اسے منہ میں دبا کر بلو کے پاس لے آتا۔ بلو دوبارہ اسے پھینکتا، اور پپی دوبارہ اٹھا لاتا۔ یہ کھیل اسی طرح جاری رہتا۔ پپی کو دیکھ کر چمکیلی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور اپنے آپ سے بولی۔

"کاش میں پپّی ہوتی! ...... پارک میں ادھر ادھر دوڑ سکتی، بھاگ سکتی...... اور گیند سے کھیل سکتی ...... کاش ایسا ہوتا!...... کاش میں ایک چھوٹا سا، تیز رفتار، اور پیاری پیاری آواز میں بھوں بھوں کرنے والا کتا بن جاؤں!...... کاش!......"

وہ بہت زیادہ افسردہ ہو گئی۔ اور اپنے گلاس ٹینک کی تہہ میں موجود ریت پر لیٹ گئی۔ وہ غمگین تھی۔ مگر اب بھی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ننھی سی، پیاری سی، چمکدار چمکدار۔ اسی وقت ایک لڑکا سیٹی بجاتا ہوا چمکیلی کے گلاس ٹینک کے قریب سے گزرا۔

یہ "بلو" تھا۔ خوبصورت سا، چھوٹا سا، صحت مند بچہ۔

جب چمکیلی نے اسے دیکھا تو اس کے منہ سے بے اختیار ٹھنڈی سانس خارج ہوئی اور ایک بڑا سا بلبلہ اوپر کی طرف بلند ہوتا چلا گیا۔

"اگر میں ایک لڑکا ہوتی ......۔" چمکیلی نے گڑ گڑ کرتے ہوئے کہا۔ "تو خوبصورت اور دلچسپ کہانیاں پڑھ سکتی ...... کھیل سکتی ...... بھاگ دوڑ سکتی ...... اور سیٹی بجا سکتی ...... کاش میں سیٹی بجانے والا لڑکا ہوتی!...... کتنا مزہ آتا!......"

گمشدہ برِّاعظم

گمشدہ برِّاعظم دراصل ایک داستان ہے۔ اس برِّاعظم کو اٹلانٹس کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں افلاطون نے جو ایک یونانی فلسفی تھا۔ لکھا ہے کہ وہ اس برِّاعظم میں رہا۔ وہ برِّاعظم ایشیا اور افریقہ سے بھی بڑا تھا۔ یونانی داستانوں کے مطابق اٹلانٹس پر ایک طاقتور قوم حکومت کرتی تھی۔ اس نے اپنے دیوتاؤں کو ناشکری اور بے ادبی سے ناراض کر دیا۔ دیوتاؤں نے اس قوم پر اپنا قہر نازل کیا۔ کچھ کہانیوں کے مطابق یہ برِّاعظم غروب ہو گیا اور کچھ کے مطابق اس کو ایک زلزلے نے تباہ کر دیا۔ یہ نو ہزار قبلِ مسیح کی بات ہے۔ کچھ لوگ اٹلانٹس اور امریکا کو ایک ہی برِّاعظم کہتے ہیں کچھ اسے ایسکینڈینیویا اور کناری کے جزیرہ سے تشبیہہ دیتے ہیں اور کچھ اسے فلسطینی علاقہ کہتے ہیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ علاقہ ایک آتش فشاں کے پھٹنے سے تباہ و برباد ہو گیا۔

مرسلہ: سیّد عدنان یوسف، کراچی۔

اس دن چمکیلی بہت افسردہ رہی۔

اگلے روز بہت زیادہ گرمی تھی۔ صبح سے ہی پسینے چھوٹنے شروع ہو گئے۔ اور دوپہر تک گرمی انتہائی شدید ہو چکی تھی۔ تمام پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں گھس کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کے حلق خشک ہو چکے تھے۔ ایسے میں وہ نہ چہک سکتے تھے، نہ گا سکتے تھے۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔

"پپّی" ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ آج وہ ادھر ادھر نہیں بھاگ رہا تھا۔ نہ ہی اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ کیونکہ آج غضب کی گرمی پڑ رہی تھی۔

"بیلو" بھی ٹانگیں پھیلائے گھاس پہ لیٹا ہوا تھا۔ اس نے اتنی زیادہ گرمی آج تک نہیں دیکھی تھی۔

مگر ....

"چمکیلی" آج بھی ٹھنڈے اور صاف شفاف پانی میں بڑے مزے سے "چھپ چھپ" کرتی تیر رہی تھی۔

"اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر ..... دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں" چمکیلی باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔

"مجھے خوشی ہے، میں ایک مچھلی ہوں۔" چمکیلی نے سوچا۔ "ادھر ادھر تیر سکتی ہوں، کھیل سکتی ہوں ...... ہاں! ...... خدا کا شکر ہے! ...... اور خوشی کی بات ہے کہ میں آبی مخلوق ہوں، خشکی کی نہیں .... شکر ہے خدا کا! ......

میرے لئے آج بھی ٹھنڈک ہے ...... مزے دار ٹھنڈک ...... گرمی کا دور دور تک پتا نہیں ...... شکر ہے خدا کا! ...... میں چمکدار، چمکنے والی مچھلی ہوں ...... شکر ہے خدا کا! ......

یہ گلاس ٹینک واقعی میرے لئے بہترین جگہ ہے......"

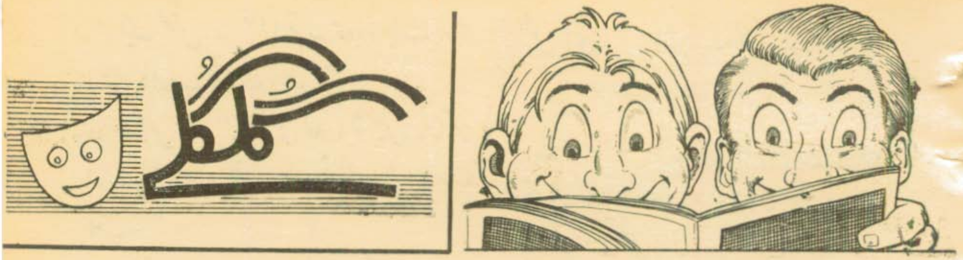

ایک صاحب اپنے نوجوان صاحبزادے کو جو گھڑ دوڑ کا بہت رسیا تھا ایک ماہرِ نفسیات کے پاس لے کر آئے اور جھلّا کر بولے۔

"جناب! اس کے دماغ میں گھوڑے بھرے ہیں۔ خواب میں بھی اسے گھوڑے نظر آتے ہیں۔ اسے تو یہ بھی یاد نہیں کہ اس کی نوکری کس دن لگی تھی؟"

"کیوں یاد نہیں!" صاحبزادے نے جلدی سے کہا۔ "میری نوکری اس دن لگی تھی جس دن راجہ زُلفی نے ڈربی ریس جیتی تھی۔"

مرسلہ ...... آصف خان، کراچی۔

جنرل شرمن کے اعزاز میں تقریب ہو رہی تھی۔ جنرل نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "اگر میں جہنم اور ٹیکساس دونوں کا مالک ہوتا تو ٹیکساس کو کرائے پر دے دیتا اور جہنم میں رہنا پسند کرتا۔"

"بالکل دُرست فرمایا۔" ٹیکساس کے ایک باشندے نے کہا، "ہر شخص اپنے وطن میں رہنا پسند کرتا ہے۔"

مرسلہ ...... منوّر حسین رانا، کراچی

مارہرے کی خانقاہِ برکاتیہ کے بزرگ سیّد صاحب عالم نے غالبؔ کو ایک خط لکھا۔ ان کی تحریر نہایت شکستہ تھی۔ اسے پڑھنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ غالبؔ نے خط پڑھا تو بڑے جِزبِز ہوئے۔ جواب میں لکھا "پیر و مرشد! خط ملا، چوما چاٹا، آنکھوں سے لگایا، آنکھیں پھوٹیں جو ایک حرف بھی پڑھا ہو۔ تعویز بنا کر تکیے میں رکھ لیا ہے۔" فقط نجات کا طالب

غالبؔ

مرسلہ ...... عبدالوحید، کراچی۔

دہلی کی سڑک پر بس سے ٹکرا کر ایک آدمی بے ہوش ہو گیا۔ اس کے چاروں طرف بھیڑ اکٹھی ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہوش آنے پر اس شخص نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا "میں کہاں ہوں؟" فوراً ایک آدمی آگے بڑھا اور اس نے ایک چھوٹی سی کتاب اس آدمی کی طرف بڑھائی اور کہا۔ "یہ لیجئے دہلی گائیڈ! دہلی کی ہر جگہ کا نقشہ اس میں دیا ہوا ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ پچاس پیسے۔"

مرسلہ ...... واثق کیفی، ضلع اٹک۔

ایک شخص:۔ "کیا تم یہ محاورہ جانتے ہو؟ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا۔"
دوسرا شخص:۔ "جی نہیں محاورہ تو نہیں جانتا مگر اینٹ کا جواب پتھر سے دینا اچھی طرح جانتا ہوں۔"

مرسلہ ...... عاطف اقبال، لاہور۔

لڑکا:۔ "امیّ! میری کلاس کے لڑکے بہت خراب ہیں۔ آج ایک لڑکا دوڑتے ہوئے گر پڑا تو سب لڑکے ہنسنے لگے۔ مگر میں نہیں ہنسا۔"
ماں: "شاباش بیٹا! اچھے بچے ایسا ہی کرتے ہیں۔ مگر گرا کون تھا؟"
لڑکا: (منہ بسورتے ہوئے) "امیّ! میں!!"

مرسلہ ...... ندیم احمد گل، چنیوٹ

ایک انگریز نے یہودی سے کہا، "یہودی اتنا روپیہ کیسے کما لیتے ہیں۔ یہ تو بہت عقلمندی کی بات ہے۔" یہودی نے ذرا سوچ کے کہا، "ہم ایک خاص مچھلی کھاتے ہیں۔ وہ مچھلی عقل کے لئے بہت مُفید ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں دے سکتا ہوں لیکن اس کی قیمت بیس ڈالر ہے۔" انگریز نے بیس ڈالر یہودی کے ہاتھ پہ رکھے۔ یہودی نے اسے ایک چھوٹی سی مچھلی دے دی۔ انگریز نے مچھلی منہ میں رکھی اور چلّایا "اس بد ذائقہ مچھلی کے تم نے بیس ڈالر اینٹھ لئے۔ بیس ڈالر میں تو ایسی چھ مچھلیاں آجائیں۔"
"دیکھا مچھلی کی تاثیر! پہلے ہی نوالے میں تمہیں عقل آگئی۔" یہودی نے مکّاری سے کہا۔

مرسلہ ...... خالد حماد فیاضی، شیخوپورہ۔

ایک صاحب ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔ اتنے میں انہوں نے دیکھا کہ ان کی سالن کی پلیٹ میں مری ہوئی مکھی پڑی ہے۔ وہ چیخ کر بولے۔
"ویٹر! یہ دیکھو میری پلیٹ میں مکھی پڑی ہے۔"
ویٹر نے ان کے کان میں کہا۔
"آہستہ بولئے جناب! دوسرے گاہکوں نے سُن لیا تو وہ بھی مانگیں گے۔ ہمارے پاس صرف ایک ہی تھی۔"

مرسلہ ...... عدیل محمد خان، حیدر آباد۔

"ایک بھولا بھالا دیہاتی سیر و سیاحت کی غرض سے شہر پہنچا۔ ایک ہوٹل میں قیام کے بعد اس نے بیرے سے پوچھا کہ اس ہوٹل میں کھانے کے کیا اوقات ہیں؟ بیرے نے جواب دیا۔
"یہاں صبح سات بجے سے لے کر گیارہ بجے تک ناشتہ ہوتا ہے۔ بارہ بجے سے ۳ بجے تک دوپہر کا کھانا ہوتا ہے اور پانچ بجے سے ۹ بجے رات کا کھانا ہوتا ہے۔"
دیہاتی نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا "اگر دن بھر ناشتے اور کھانے میں گزر گیا تو میں شہر کی سیر کیسے کروں گا؟"

مرسلہ ...... کریم بخش بلوچ، دبئی۔

ایک ہوا باز اپنے دوست سے کہہ رہا تھا۔

"تمہیں نہیں معلوم کہ گزشتہ ہفتے مجھے کس قدر وحشت ناک صورتحال سے دوچار ہونا پڑا۔ جہاز کا انجن کام نہیں کر رہا تھا آسمان پر گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ جہاز میں ایک قطرہ پٹرول بھی باقی نہ رہا تھا۔"

دوست نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "گویا یہ معجزہ ہی تھا کہ تم بخیر و عافیت زمین پر اتر آئے۔"

ہوا باز مسکرا کر بولا۔

"میں تو رن وے پر ہی کھڑا تھا۔"

ایک محلے میں مسلسل چوریاں ہو رہی تھیں۔ ایک امیر گھرانے کو اس فکر نے پریشان کر رکھا تھا۔ گھر کے کسی فرد نے ایک دن ایک چھوٹا سا بورڈ دروازے پر لگا دیا اور اس پر ایک بلب بھی روشن کر دیا۔ بورڈ پر یہ عبارت لکھی تھی: "یہاں آنے کی تکلیف نہ کریں کیونکہ ہمارے پاس جو کچھ بھی تھا وہ ہم نے بینک میں جمع کرا دیا ہے۔" اگلے روز گھر والوں نے دیکھا کہ بورڈ پر ایک نیا فقرہ درج تھا۔ "برائے مہربانی بینک کا نام بھی لکھ دیں۔"

مرسلہ ...... نعمان احمد خان، کراچی۔

تین قیدی اپنے آپ کو جیل کا سب سے پرانا قیدی ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

پہلا ...... کہنے لگا "میں یہاں اس وقت آیا جب ٹرین ایجاد ہوئی تھی۔"

دوسرا ...... کہنے لگا "میں یہاں اس وقت آیا جب لوگ گھوڑوں پر سفر کرتے تھے۔"

تیسرا ...... کمال معصومیت سے بولا "یہ گھوڑے کیا ہوتے ہیں؟"

مرسلہ ...... عبدالحفیظ شاہد، مخدوم پور پہوڑاں

ترقی یافتہ ملک کے ایک بڑے سائنس دان نے طلبا کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ "فرض کرو اگر میں ایک ایسا ایٹمی ہتھیار بنا لوں جس سے ساری دنیا پل بھر میں ختم ہو جائے تو کیا ہو گا؟"

"جناب، آپ کو نوبیل پرائز دینے والا کوئی نہ رہے گا۔" ایک آواز آئی۔

محمد اختر جاوید دیپالپور۔

ڈاکٹر کے پاس ایک مریض آیا اور کہنے لگا۔

ڈاکٹر صاحب، ...... آپ نے مجھے پہچانا؟

ڈاکٹر ...... جی نہیں۔

مریض ...... ڈاکٹر صاحب میں وہی مریض ہوں جسے دو سال پہلے نمونیہ ہو گیا تھا اور آپ نے نہانے سے منع کیا تھا میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ کیا اب میں نہا لوں؟

سید وجاہت علی شاہ۔ گولارچی، سندھ

مزید محنت کی ضرورت ہے

ہمیں ہر ماہ سینکڑوں کی تعداد میں کہانیاں، مضامین ونظمیں موصول ہوتی ہیں۔ بہت سی تحریریں ایسی ہوتی ہیں جو آنکھ مچولی کے معیار پر پوری نہیں اُترتیں۔ ادارے کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ خط کے ذریعے براہِ راست دوستوں کو ان کی تحریر کے قابلِ اشاعت یا ناقابلِ اشاعت ہونے کی اطلاع فراہم کردی جائے لیکن ڈھیر ساری تحریروں کے ہجوم میں اکثر یہ ممکن نہیں ہوتا۔ ہم دوستوں کی اطلاع کے لئے "مزید محنت کی ضرورت ہے" کے عنوان سے ناقابل اشاعت تحریروں کا ایک الگ صفحہ مخصوص کررہے ہیں۔

(ادارہ)

"کشمیر کی بیٹی" افشین اسد، کراچی۔ "بادشاہ ان ٹربل" حسّام عثمانی، حیدر آباد۔ "سچی دوستی" عفّت فاطمہ کاظمی، راولپنڈی۔ "شیخ چلّی" راؤ محمد ذوالفقار علی، اسلام آباد۔ "قیمتی راز" زبیدہ کاظمی سندھ "خون کا رشتہ" شازلی مشتاق، کراچی۔ "تعویز" ممتاز حبیب صابر، مردان۔ "نومی کا کارنامہ" نعمان انوار احمد خان، کراچی۔ "ننھے جاسوس" نوشین صدف، رحیم یار خان۔ "قائد اعظم" (انتخاب) محمد عثمان سلیم، لاہور۔ "ہوائی جہاز" (ایجاد نمبر) اسد اللہ سمّوں، حیدر آباد۔ "والدین کی اطاعت" (نامعلوم) "چالاک بھائی" ندیم مغل، میرپور ساکرو۔ "ہیروں کی چوری" محسن احسان، نوشہرہ۔ "دنیا کا سب سے بڑا" ایم اسحاق، راجن پور۔ "آزاد ہو کر بھی ہم غلام ہیں" (نظم) شیراز احمد، لاہور۔ "سنہری انگوٹھی" عمران بیگ، گجرات۔ "اثر بد دعا" ولید جان، پسنی مکران۔ "تین پریاں" حنا ایوب صدّیقی، نیو کراچی۔ "طاقت ور کون" مریم جاوید (نامعلوم مقام)۔ "نقل کی سزا" عبدالرفیق نگینہ والے، کراچی۔ "مقصدِ زندگی" صائم مصطفیٰ متلاشی، (نامعلوم مقام)۔ "باپ کی نصیحت" نثار احمد خان، ڈھاڈر۔ "بے دردی" (نظم) سعدیہ فاطمہ لاہور۔ "جنوں کی بستی" عثمان نعیم لاہور۔ "عقلمند بیوی" محمد شیراز خان، حیدر آباد۔ "انتقام کی آگ" سجّاد حسین، ایبٹ آباد۔ "بھورا بال" عتیق ساجن، لاہور۔ "بہروپیا" عنبرین ریاض، میانوالی۔ "ریڈیم کی موجد کون" لیاقت علی، کوٹری۔ "کچھ تو کہئے" ممتاز حبیب صابر، مردان۔ "بد نصیب" نصرت جبیں خانم، لاہور۔ "احمد پر کیا بیتی" سلمان زیب خان، فیصل آباد۔ "ستون" احسان اللہ سرور، کھاریاں۔ "کشمیری مجاہد" شہباز اکبر اُلفت، لاہور۔ "نیا سال" طارق محمود انجم، سرگودھا۔ "سچّائی کا انعام" مرزا شکیل بیگ، کراچی۔ "دوستی"۔ محمد ابی وقاص، کراچی۔ "وسیلہ"۔ مرزا تیمور بیگ، کراچی۔ "خطرناک روبوٹ" (نامعلوم)۔ "ہمارے قائد عظیم قائد"۔ عدیل محمد خان، لطیف آباد۔ "اک آرزو"، "آزادی" (نظمیں) سہیل احمد خان جدون، کراچی۔ "دیوانے کی نصیحت"۔ سجّاد حسین مغل، روہڑی۔ "اجمل اور کٹنی" عبدالغفور عامر، خوشاب۔ "انوکھا رکھوالا"۔ ہیرا لعل، لاڑکانہ۔ "غرور کا سر نیچا"۔ عنایت فردوس، دالبندین۔ "گدھے کی چالاکی"۔ عبدالغیاث، بلوچستان۔ "اُلّو میاں کی عقلمندی" منیر احمد اعوان، کراچی۔ "پری کی نصیحت"۔ عبدالرزّاق، لیاری کراچی۔ "فرمان قائد" عمران جمیل، کراچی۔ "حیرت انگیز معلومات"۔ واجد علی، لیہ۔ "میں مزارِ قائد جاؤں گا"۔ حضور احمد آرائیں، دادو سندھ۔ "وطن کے رکھوالے"۔ عامر سلیمان، لاہور۔ "پاکستانی پرچم"۔ رانا عبدالمجید شاہین، خانیوال، "اُلٹا رواج"۔ ارشد علی، لاہور۔

ان سے تعاون کیجیے ان پر اعتماد کیجیے

وطنِ عزیز کے قریے قریے

اور نگر نگر

ہر ماہ باقاعدگی سے

آنکھ مچولی

پہنچانے کے لیے ہم نے

ان اداروں

کو اپنا باقاعدہ

ایجنٹ

مقرر کیا

ہے

محمد حسین برادرز	کراچی	۷۷۲۴۱۲۶
سلطان نیوز ایجنسی	لاہور	۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد	راولپنڈی	۵۵۴۳۲
مہران نیوز ایجنسی	حیدرآباد	۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی	پشاور	۶۲۵۱۵
اے ایس حامد نیوز سروس	مُلتان	۴۳۳۱۰
فیاض بک ڈپو	فیصل آباد	۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز	کوئٹہ	۷۵۰۰۲
اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ	
سلمان برادرز	نواب شاہ	۲۴۱۴
سعید بک اسٹال	گجرات	۳۶۳۹
پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال	سرگودھا	۶۲۹۵۱
طاہر نیوز ایجنسی	جہلم	
کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور	۲۹۵۷
چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان	۷۲۶۲۶
مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر	
رحمت بک اسٹال	اوکاڑہ	
رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ ضلع بہاول نگر۔	
ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ	۸۷۹۸۹
سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال	
مولا بخش نیوز ایجنسی	مہران مرکز سکھر	
خالد بک اسٹال	گجرات	۳۷۳۱
اسلامی نیوز ایجنسی	وہاڑی	۲۸۸۹

آنکھ مچولی

خریدنے کے لیے

اپنی تجاویز اور مشوروں کیلئے

ان ناموں پر اعتماد کیجیے

خط و کتابت کے لیے 〉 ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

انعامی مقابلہ

امتحان ہے آپ کی ذہانت کا

۱۔ تمیم اور جمشید نے ایک مربع شکل کے قطعہ اراضی پر چاروں اطراف میں پھلوں کے کچھ پودے لگائے۔ ہر سائیڈ میں ۱۶ پودے لگے۔ اگلے دن جمشید نے ۴ پودے اس بنا پر اکھاڑ دیئے کہ وہ کچھ ٹھیک دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس سے اگلے دن اس نے چار پودے دوبارہ اس قطعہ اراضی پر لگائے لیکن اس ذراسی تبدیلی سے ایک حیرت انگیز بات سامنے آئی۔ وہ یہ کہ اب ہر سائیڈ میں ۱۷ درخت موجود تھے۔ ذرا بتایئے تو یہ کیسے ممکن ہوا؟

۲۔ ایک بس میں صرف ۵۸ مسافروں کو لے جانے کی گنجائش ہے۔ ایک دن اس بس میں ڈرائیور سمیت چند افراد نے سفر شروع کیا۔ پہلے اسٹاپ پر مسافروں کی آدھی تعداد بس سے اتر گئی اور صرف ایک نیا مسافر سوار ہوا۔ دوسرے اسٹاپ پر دو مسافر اترے اور تین مسافر سوار ہوئے۔ تیسرے اسٹاپ پر بس میں موجود افراد سے چار گنا زیادہ تعداد میں مسافر بس میں سوار ہوئے۔ چوتھے اسٹاپ پر بس میں موجود افراد سے دگنی تعداد میں مسافر سوار ہوئے۔ اگلے اسٹاپ پر ۳۹ مسافر بس سے اتر گئے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پہلے اسٹاپ سے کتنے مسافروں نے بس میں سفر شروع کیا تھا؟

۳۔ اگر آپ کو ایک ہی سائز اور ایک ہی شکل کے گول سکے دیئے جائیں اور آپ سے کہا جائے ایک سکے کو درمیان میں رکھتے ہوئے سکوں کا دائرہ مکمل کیجئے تو بتایئے کہ اس کام کے لئے آپ کو کتنے سکے درکار ہوں گے۔ یاد رہے کہ ہر سکہ درمیان والے سکے کو ضرور مس کرے۔

	11		8
4		3	
5			12
	2	15	

۴۔ دی گئی تصویر میں خالی خانوں میں ۱، ۶، ۷، ۹، ۱۰، ۱۳، ۱۴ اور ۱۶ کے ہندسوں کو اس طرح لکھئے کہ ہر طرف سے گننے پر حاصل جمع ۳۴ آئے؟

گزشتہ ماہ کے سوالوں کے درست جوابات

۱۔ رحیم نے رمضان کا ہیٹ لیا۔ قیصر نے رحیم کا ہیٹ لیا۔ رمضان اور حیدر نے بالترتیب حیدر اور قیصر کا ہیٹ لیا۔

۲۔ ۱۴۴ گھنٹے کے بعد دونوں گھڑیاں دوبارہ ایک سا وقت ظاہر کریں گی۔

۳۔ بندر جب درخت پر چار میٹر کا فاصلہ طے کرتا ہے تو دراصل وہ چھ میٹر کا فاصلہ طے کرتا ہے (کیوں کہ دو میٹر نیچے کھسک آتا ہے) اس لئے جب وہ بیس میٹر کی اونچائی تک پہنچا تو دراصل اس نے تیس میٹر کا فاصلہ طے کیا۔ اب چوٹی تک پہنچنے کے لئے اسے چھ میٹر کا مزید فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ اس طرح اس نے کل چھتیس میٹر کا فاصلہ طے کیا۔

۴۔ جب جہاز تیر رہا ہو تو سطح آب میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ چونکہ جہاز کا میٹر جو سطح آب ظاہر کرتا ہے۔ اس کی تبدیلی کا تعلق جہاز کے اپنے وزن سے ہوتا ہے نہ تاکہ لہروں کی اونچائی نیچائی سے۔

اس ماہ کے سوالات ساتھیوں کے لئے کچھ مُشکل ثابت ہوئے۔ کیونکہ صرف دو ساتھی بالکل دُرست جواب دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان ذہین ساتھیوں کے نام ہیں فیصل عدنان صدّیقی، کراچی اور احمر اقبال، لاہور۔ قرعہ اندازی کے ذریعے انعام کے مستحق قرار پائے ہیں، لاہور کے احمر اقبال۔ ان کا انعام جلد ہی انہیں روانہ کر دیا جائے گا۔ البتہ دوسرے ذہین ساتھی کو ماہ مئی کا شمارہ اعزازی طور پر ارسال کیا جا رہا ہے۔

ایک غلط جواب دینے والے ساتھی :۔

عنبر خورشید، کراچی۔ فرحانہ رقیب، کراچی۔ عمیر عالم ایم یونس، حیدر آباد۔ کامران شفیع، کراچی۔ حُمیرا افتخار، پنو عاقل کینٹ۔

جن ساتھیوں کے جوابات ہمیں بروقت وصول ہوئے :۔

اُسامہ آصف حسن، کراچی۔ نعمان احمد خان، کراچی۔ حنا جتوئی، حیدر آباد۔ انجم رضا اعوان، چکوال۔ محمد عمران یونس، کراچی۔ ادیب فاطمہ، سکّھر۔ کامران آصف، لاہور۔ انعم آصف، لاہور۔ محمد عمران آصف، لاہور۔ ذیشان احمد، کھاریاں۔ سلمان احمد، کھاریاں۔ سیّدہ کاشفہ خاتون، کراچی۔ چوہدری محمد قاسم گورایہ، چوہدری حمّاد الرحمٰن گورایہ، نگہت میمونہ سحر، چوہدری رضوان احمد گورایہ، زرافشاں گورایہ، گوجرانوالہ۔ عرفان عثمانی، لاہور۔ عمران عثمانی، لاہور۔ نعمان طارق سلیم، کراچی۔ عاصم لطیف، لاہور۔ کاشف ضیابٹ، لاہور۔ ضیاالدین بٹ، لاہور۔ سیّد مظہر علی، اقصیٰ صدیقی، کراچی۔ محمد سلیم خان، کراچی۔ وسیم شاہد، سکّھر۔ اویس اقبال، کراچی۔ محمد نعمان بابر، پشاور۔ ارم فاطمہ، سکّھر۔ گل زرین مغل، ہزارہ۔ محبوب الٰہی میمن، ٹنڈو آدم۔ محمد علی جواد، لاہور۔ گلستان احمد، پشاور۔ راجہ عمر جاوید، کھاریاں۔ محمد سعید میاں، لاہور۔ نعیم احمد، کراچی۔ محمد شکیل بھٹو، دادو۔ سیّد عثمان حسنی، لاہور۔ مہر زیب خان، کراچی۔ فہد حمایت، کراچی۔ سمن زہرہ، کراچی۔ عمران علی، ٹھٹھہ۔ کاشف محمود، گوجرانوالہ۔ غلام دستگیر جاوید، فیصل آباد۔ ناہید اختر، لاہور۔ ماسٹر شیر محمد پنہور، میرپور خاص۔ ذکیہ زیدی، راولپنڈی۔ عماد فاروق خان، سکھر۔ محمد زبیر، لاہور۔ طاہرہ بلال،

پشاور۔ راحیل بن محمد یحییٰ، حیدر آباد۔ محمد ریحان اصغر، فریحہ اصغر، لاہور۔ خواجہ محمد اقبال، ملتان۔ خواجہ محمد کاشف، ملتان۔ محمد سلیم رضا، لاہور۔ محمد اعجاز پرنس، راولپنڈی۔ طاہر محمود مجددی، گوجرانوالہ۔ محمد مومن رشید، پشاور۔ آصف وقار آصف، واہ کینٹ۔ مہوش، واہ کینٹ۔ عامر الیاس، کراچی۔ نواب مرزا دلاور بیگ،، نواب مرزا کرن بیگ، نواب مرزا ماہین بیگ، نواب مرزا زوار بیگ، نواب مرزا زور آور بیگ، اسلام آباد۔ صائمہ دلدار جھمرہ سٹی۔ زبیر احمد خان، کراچی۔ سدرہ عالم، لاہور۔ افتخار احمد شیرازی، ٹنڈو آدم۔ عبدالرحمٰن، پسرور۔ الطاف حسین، بورے والا۔ محمد اصغر، اقرانورین، عشرت علی، نصرت علی، نصیر احمد، محمد شریف، محمد عمر عظیم، جہانگیر علی، عارف شریف، مہرین اختر، سرگودھا۔ خورشید انور، کراچی۔ عبدالستار خان طاہر، بوریوالا۔ سلیم الدین، کراچی۔ زبیر کامران، لاہور۔ محمد ارشد، کراچی۔ نوشابہ شبیر احمد، گوجرانوالہ۔ عمران شریف، آصف شریف، مقبول احمد شاہین، ظفر اقبال چوہدری، خالد اقبال چوہدری، شاہد اقبال چوہدری، نور محمد، محمد یعقوب، محمد شبیر، محمد سلیم، رضوان شریف، حیدر اقبال شاہین، فرید اقبال شاہین، نوید اقبال شاہین، جاوید اقبال شاہین، نازیہ خانم، فوزیہ خانم، تہمدہ خانم، طیب علی، زبیر احمد، سمیرا، حمیرا، سمیعہ خانم، سرگودھا۔ حفیظ اللہ، کشمور۔ سیف اللہ بیگ، راولپنڈی۔ کاشف اعجاز، ڈنگہ۔ افتخار بیگ، کھاریاں۔ عبدالجبار تبسم، کھاریاں۔ جعفر مسعود، واہ کینٹ۔ اسد اللہ بیگ، راولپنڈی۔ فہیم عنائت شیخ، کراچی۔ محمد علی یاسین، حیدر آباد۔ شہباز حیات، کھاریاں۔ محمد عبداللہ خان، ملتان۔ شازیہ نشاط، کراچی۔ اظہر حسین، میرپور (آزاد کشمیر) رانا محمد طاہر شعیب، شیخوپورہ۔ مالیہ نشاط، کراچی۔ عبدالصمد قریشی، حیدر آباد۔ جہاں زیب شاہین، حیدر آباد۔ بابر کمال، راولپنڈی۔ محمد عبدالرحمٰن، لاہور۔ محمد عمر اختر قریشی، اسلام آباد۔ محمد عظیم قریشی، اسلام آباد۔ محمد اختر قریشی، اسلام آباد۔ محمد فیاض، لاہور۔ محمد ریاض، پتوکی۔ سید شہزاد واسطی، لاہور۔ ادیبہ واسطی، جواد واسطی، لاہور۔ غلام شبیر، شورکوٹ۔ حِنا کنول، (؟) ثناء اختر قریشی، اسلام آباد۔ عصمت رسول، کراچی۔ شہمیزہ زرین قریشی، حیدر آباد۔ شہلا صدیقی، ٹنڈو آدم۔ فہد فیروز شیخ، حیدر آباد۔ محمد کاشف سعید خان، کراچی۔ نائلہ جاوید، (؟) عشرت رضا، راولپنڈی۔ مجاہد حسین، کراچی۔ لئیق حسین عارف، اٹک شہر۔ تنویر شہزاد، بہاولپور۔ محمد ندیم خالد، بہاولپور۔ صبا شفیق، فیصل آباد۔ اختر حسین اعوان، چکوال۔ فاریہ تقدیس، اٹک ۔ وردہ تقدیس، اٹک سٹی۔

اس مقابلے میں ہم آپ سے حسابی نوعیت کے اور کامن سنس کے صرف چار سوالات پوچھتے ہیں۔ بالکل صحیح جوابات دینے والے ذہین ساتھی کو ایک عدد **کیلکولیٹر** انعام کے طور پر دیا جاتا ہے۔ زیادہ تعداد میں صحیح جوابات موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کیا جاتا ہے۔

مقابلے میں شرکت کی شرائط حسبِ ذیل ہیں (1) جوابات واضح، صاف اور خوش خط لکھئے (2) جوابات ماہِ رواں کی ۱۲ تاریخ تک ادارے کو موصول ہو جائیں (3) بالکل الگ لفافے میں الگ کاغذ پر صرف جوابات اور بھیجنے والے کا مکمل پتہ درج ہو، تاخیر سے اور پتے کے بغیر موصول ہونے والے خطوط مقابلے میں شریک نہیں کئے جائیں گے؛

(پتہ) انچارج انعامی مقابلہ "امتحان ہے آپ کی ذہانت کا" ماہنامہ "آنکھ مچولی" ا-پی آئی بی کالونی، کراچی

غائب دماغ

عبدالقادر

بہت مشہور ہیں غائب دماغی میں پروفیسر
وہ غور و فکر کے دریا میں رہتے غرق ہیں اکثر
سنا ہے اک پروفیسر پہنچ کر شب کو کمرے میں
چھڑی کونے میں رکھتے اور جاتے پھر مسہری پر
گئے اک رات کمرے میں تو حرکت ہوگئی الٹی
چھڑی رکھ دی مسہری پر، کھڑے خود ہو گئے جاکر
گزاری رات، کونے میں، سمجھ میں کچھ نہیں آیا
بنا ہوں میں چھڑی کیسے؟ پریشاں تھے پروفیسر
کسی اک اور ایسے ہی پروفیسر کا قصّہ ہے
جماعت میں انھیں دینا تھا مینڈک پر اہم لیکچر
چلے اک کیک اور مینڈک کو لے کر اپنی جیبوں میں
جماعت میں کہا جا کر "مرا لیکچر ہے مینڈک پر"
یہ کہہ کر کوٹ کی جیبوں میں اپنے ہاتھ پہنچائے
فقط وہ کیک ہی پایا، نکالے ہاتھ جب باہر
لگے وہ بڑبڑانے کیک تو رستے میں کھایا تھا
کہاں غائب ہوا مینڈک؟ پریشاں تھے پروفیسر
بہت مشہور ہیں غائب دماغی میں پروفیسر
وہ غور و فکر کے دریا میں رہتے غرق ہیں اکثر

بادشاہ کا علاج

سیّد نظر زیدی

کہتے ہیں بہت پُرانے زمانے میں ایک ملک کا بادشاہ بیمار ہو گیا۔ بیمار ہو جانا کوئی نرالی بات نہیں۔ بیماریاں فقیروں اور بادشاہوں میں فرق نہیں کرتیں۔ جو بھی صحت کے اصولوں سے بے پروا ہوتا ہے، بیمار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی سب کے لئے ایک سی ہے کہ مُناسب علاج کرنے سے بیمار اچّھا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس بادشاہ کو ایسی بیماری لگی کہ کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آتی تھی۔ بادشاہ نے اپنے ملک کے حکیموں اور ویدوں کے علاوہ پڑوسی ملک کے حکیموں اور ویدوں سے بھی علاج کرایا، لیکن کسی کی دوا سے آرام نہ آیا۔ آرام آنا تو رہا ایک طرف، کوئی یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ یہ بیماری ہے کیا اور کس وجہ سے لگی ہے؟

جب ہر طرف سے مایوسی ہوئی تو ایک دن بادشاہ کا وزیر اعظم اس کے پاس آیا اور اس سے کہا۔ "عالی جاہ، اگرچہ حکیموں اور ویدوں نے یہ کہہ دیا ہے کہ نہ ان کی سمجھ میں حضور کی بیماری کی وجہ

آئی ہے اور نہ وہ اس کا علاج معلوم کر سکے ہیں، تو مایوس ہونے کی بات نہیں۔ اس خادم کو یقین ہے اللہ پاک اپنی خاص رحمت سے حضور کو تندرست کر دے گا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو!" بادشاہ نے مایوس ہو کر کہا۔ "ویسے اب ہمارا تندرست ہونا مشکل ہے۔ حکیم اور وید پوری پوری کوشش کر چکے ہیں۔ کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ یہ کونسی بیماری ہے۔ پھر ہم تندرست ہوں گے تو کس طرح؟ لگتا ہے ہمارا آخری وقت آگیا ہے۔"

"حضور اجازت دیں تو ایک بات عرض کروں؟" وزیر نے کہا۔

"تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو۔ ہمیں یقین ہے تم ہمارا بھلا چاہنے والے ہو۔ اگر تمہاری رائے ٹھیک معلوم ہوئی تو اس پر عمل کریں گے۔" بادشاہ نے اجازت دے دی۔

"یہ عرض کرنا ہے تو گستاخی، لیکن اس خادم کے نزدیک حضور کسی ایسے شخص کی بد دُعا کی وجہ سے بیمار ہوئے ہیں جسے بےوجہ ستایا گیا۔ یاد فرمایئے کہ کیا کبھی ایسا ہوا ہے؟" وزیر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"یہ بات تم نے کیسے سوچی؟" بادشاہ نے پوچھا۔

"یہ بات اس خادم نے اس وجہ سے سوچی ہے کہ ایسی بیماری بد دُعا سے ہی لگتی ہے۔"

بادشاہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ "ملک کا حکمران ہونے کی وجہ سے ہمیں لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے اور یہ بات پورے پورے یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ سب مقدموں کے فیصلے بالکل ٹھیک کئے ہوں گے۔ ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ بعض چالاک لوگ جھوٹے گواہ پیش کر کے بے گناہوں کے سزا دلوا دیتے ہیں۔ ہاں یہ بات یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ جان بُوجھ کر ہم نے دشمنوں کے ساتھ بھی بے انصافی نہیں کی۔ پھر بھی تم پورے ملک میں مُنادی کرا دو کہ اگر کبھی کسی کے ساتھ بے انصافی یا ظلم ہوا ہے تو ہماری خدمت میں حاضر ہو۔ ہم فوراً اس کا نقصان پورا کر دیں گے اور اس سے معافی بھی مانگیں گے۔"

بادشاہ کا یہ وزیر بہت بڑا عالم اور بہت عقلمند تھا۔ اس نے بالکل ٹھیک سوچا تھا کہ انسانوں کو جو تکلیفیں پہنچتی ہیں ان کی وجہ ان لوگوں کی بد دُعا بھی ہوتی ہے جن پر ظلم کیا گیا ہو۔ بادشاہ نے اجازت دے دی تو اس نے اُسی دن پورے ملک میں مُنادی کرا دی۔ "اگر کسی کے دل میں یہ خیال ہو کہ بادشاہ سلامت نے اس کے ساتھ بےانصافی کی ہے تو وہ فوراً حاضر ہو۔ اس کا نقصان پورا کیا جائے گا اور ساتھ بھاری انعام بھی دیا جائے گا۔"

مُنادی کے بعد ہزاروں آدمی بادشاہ کے محل کے سامنے اکٹھے ہو گئے اور وزیر ان کے حالات سن کر ان کا نقصان پورا کرتا رہا۔ اس کام میں کئی دن لگ گئے۔ جو بھی وزیر سے ملتا تھا بادشاہ کی صحت کے لئے دعائیں کرتا تھا، لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ شاہی خزانے کا کئی کروڑ روپیہ خرچ ہو جانے کے باوجود بادشاہ کی حالت میں فرق نہ آیا۔

یہ حالت دیکھ کر وزیر بہت پریشان ہوا۔ اسے پکا یقین تھا کہ مظلوموں کو ان کا حق مل جائے گا اور وہ بد دعا کی جگہ بادشاہ سلامت کو دُعائیں دیں گے تو وہ ضرور تندرست ہو جائیں گے۔ خود بادشاہ کو بھی کچھ کچھ یقین تھا کہ اس تدبیر سے اسے آرام آ جائے گا لیکن جب اس کی حالت میں فرق نہ آیا تو اس نے بہت مایوس ہو کر وزیر سے کہا۔

"مابدولت نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ بیماری موت کا پیغام لے کر آئی ہے۔ اگر آرام آنا ہوتا تو حکیموں اور ویدوں کے علاج سے آجاتا۔ بہرحال مابدولت تمہارا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ تم نے کوشش کی۔ اب مُناسب یہ ہے کہ ہماری موت کے بعد پیدا ہونے والے حالات کے بارے میں سوچو۔ ہمیں اس سلسلے میں یوں فکر ہے کہ ہمارا بیٹا کم عمر ہے۔ اسے ناسمجھ اور کمزور جان کر دشمن ضرور فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں گے۔ پہلے سے کچھ بندوبست کر لیں گے تو شہزادہ پریشانی سے بچ جائے گا۔"

"ایسی مایوسی کی باتیں نہ کیجئے عالی جاہ، اللہ پاک کی رحمت سے مایوس ہونا گناہ ہے۔ اگر ہماری ایک تدبیر ناکام ہو گئی ہے تو کوئی دوسرا طریقہ اختیار کریں گے اور انشاء اللہ حضور بالکل تندرست ہو جائیں گے۔" وزیر نے کہا۔

"بیشک اللہ کی رحمت سے نااُمید نہیں ہونا چاہئے، لیکن موت اور زندگی کا وقت بھی تو اللہ پاک ہی نے مقرر کیا ہے اور مابدولت یوں محسوس کر رہے ہیں کہ ہماری موت کا وقت قریب آگیا ہے۔ پھر بھی اگر تم کوئی اور کوشش کرنا چاہتے ہو تو یوں کرو کہ کسی ایسے آدمی سے ہمارے لئے دُعا کراؤ جس نے اپنی پوری زندگی میں کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ تم نے دُعا کے اثر کی بات کی تو یہ بات ہمارے ذہن میں آئی تھی۔ ہم خیال کرتے ہیں اللہ پاک ایسے معصوم آدمی کی دُعا ضرور قبول کرے گا اور ہم تندرست ہو جائیں گے۔ کیا تم کسی ایسے آدمی کو جانتے ہو؟" بادشاہ نے سوال کیا۔

وزیر نے جلدی سے بولا "حضور والا، یہ خادم کسی ایسے آدمی کو جانتا تو نہیں، لیکن یقین ہے ہمارے ملک میں ایسے بہت سے آدمی مل جائیں گے۔ میں آج ہی سے تلاش میں نکلتا ہوں، مجھے بھی یقین ہے ایسا نیک آدمی دعا کرے گا تو حضور فوراً تندرست ہو جائیں گے۔"

بات ختم کر کے وزیر نے بادشاہ سے اجازت لی اور سیدھا اس عالم کے پاس پہنچ گیا جو ایک بہت بڑا دینی مدرسہ چلا رہا تھا۔ پورے ملک میں اس کی نیکی

اور شرافت کی شہرت تھی۔ وہ طالب علموں کو مقدّس کتاب پڑھانے اور اللہ کی عبادت کرنے کے سوا دنیا کا کوئی اور کام نہیں کرتا تھا۔ اس کی زبان میں ایسا اثر تھا کہ سخت دل کافر بھی اس کی باتیں سُن کر ایمان لے آتے تھے۔ وزیر نے خیال کیا یہی وہ آدمی ہے جس کی دُعا سے بادشاہ تندرست ہو سکتا ہے۔ لیکن جب اس عالم کی خدمت میں حاضر ہو کر وزیر نے مختصر لفظوں میں اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اور بادشاہ کی صحت کے لئے دُعا کرنے کی درخواست کی تو وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا "وزیر اعظم صاحب، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے کسی سے کوئی غلطی نہ ہوئی ہو۔ میں اب تو گناہوں سے بچنے کی پوری پوری کوشش کرتا ہوں، لیکن نادانی کی عمر میں تو خدا جانے کتنے گناہ ہوئے ہوں گے۔ مناسب ہو گا آپ کسی اور کو تلاش کیجئے۔ شاید اللہ کا کوئی بندہ نکل آئے جس نے اپنی پوری زندگی میں کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ "میں تو ایسا نہیں ہوں۔"

عالم سے مایوس ہو کر وزیر اس فقیر کے پاس گیا جو بستیوں سے دور جنگل بیابان میں رہتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا جس سے کسی کو تکلیف پہنچے یا کسی کا حق ضائع ہونے کا شبہ بھی کیا جا سکتا۔ وہ درختوں کے پھلوں اور چشمے کے پانی پر گزارا کرتا اور دن رات اللہ کی عبادت کرتا رہتا تھا۔

اوّل تو فقیر نے وزیر کو اپنی کٹیا میں آنے کی اجازت ہی نہ دی، کہا، "بابا، تم دنیا والوں سے ہمارا کچھ تعلق نہیں۔ بڑی مشکل سے ملاقات کی تو وزیر کی بات سُنتے ہی اس نے بھی کانوں کو ہاتھ لگا دیئے۔ کہنے لگا "بابا، میں تو شاید تم دنیا داروں سے بھی زیادہ گناہگار ہوں۔ بچپن لڑکپن اور جوانی تمہاری بستیوں ہی میں گزاری اور خدا جانے کتنے گناہ کئے۔ سچ پوچھئے تو اپنے گناہ بخشوانے کے لئے ہی اس ویرانے میں آبسا ہوں۔ تم کسی اور کو تلاش کرو۔" شاید کوئی ایسا مل جائے جس نے زندگی بھر کوئی گناہ نہ کیا ہو اور اس کی دُعا سے تمہارا بادشاہ تندرست ہو جائے۔"

وزیر مایوس ہو کر وہاں سے بھی لوٹ آیا اب اس کا دھیان شاہی عبادت گاہ کے پیشوا کی طرف گیا۔ اس کی نیکی کا بھی بہت چرچا تھا۔ لوگ اسے ولی اللہ کہتے تھے اور مشکل کاموں میں اس سے دُعا کراتے تھے۔ وزیر اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور بادشاہ کی صحت کے لئے دُعا کی درخواست کی۔

شاہی عبادت گاہ کا پیشوا غور سے اس کی بات سنتا رہا۔ پھر افسوس کے انداز میں بولا "وزیر اعظم صاحب، ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے پوری زندگی نیکی اور بُرائی کا فرق سمجھتے ہوئے گزاری ہے۔ جان بوجھ کر کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے کسی کو تکلیف پہنچے، یا کسی کا حق مارا جائے، لیکن پھر بھی یہ [illegible] نہیں کر سکتے کہ کوئی گناہ نہیں

کیا۔ ویسے ہم بادشاہ سلامت کی صحت کے لئے دُعا کرتے ہیں اللہ پاک انہیں تندرست کر دے اور ان کی عمر میں برکت دے۔ وہ واقعی ایک اچھے حکمران ہیں۔"

عبادت گاہ کے کے پیشوا کی بات سن کر وزیر خوش ہو گیا۔ اسے یقین ہوا اب بادشاہ سلامت تندرست ہو جائیں گے، لیکن ایسا نہ ہوا۔ بیماری جوں کی توں رہی۔ بلکہ کچھ اور بڑھ گئی۔ اب تو بادشاہ کی طرح وزیر بھی مایوس ہو گیا۔ اسے بھی یقین ہو گیا یہ بیماری بادشاہ کی جان لے کر چھوڑے گی۔

یہ وزیر بادشاہ کا بچپن کا ساتھی تھا۔ دونوں ساتھ پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ پھر بادشاہ نیک بھی بہت تھا۔ جہاں تک ہو سکتا تھا لوگوں کی بھلائی کے کام کرتا تھا اور بُرائی کے راستے پر چلنے والوں کو سخت سزا دیتا تھا، چنانچہ ان سب باتوں کی وجہ سے وزیر اسے سگے بھائیوں کی طرح چاہتا تھا۔ اس کے تندرست ہونے کی اُمید نہ رہی تو اسے بہت صدمہ ہوا، اور وہ ہر وقت اُداس رہنے لگا۔

ایک دن وزیر اُداس بیٹھا بادشاہ کی موت اور اس کے بعد تخت پر بیٹھنے والے کم عمر شہزادے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کی بیوی اس کے پاس آئی۔ اپنے شوہر کی بدلی ہوئی حالت سے وہ خاصی پریشان تھی اور اس کے اُداس اور پریشان رہنے کی وجہ پوچھنے کا موقع ڈھونڈ رہی تھی۔ اس وقت اسے اکیلا دیکھا تو اس کے پاس آ گئی اور بہت اپنائیت کے انداز میں بولی، "میں دیکھ رہی ہوں آپ چند دن سے بہت اُداس اور پریشان رہتے ہیں۔ کیا کوئی خاص واقعہ ہو گیا ہے؟ اگر ایسی

واشنگٹن اور جمعہ

امریکا کے سابق صدر جارج واشنگٹن کی زندگی میں جمعہ کا دن بڑا اہم اور مُبارک تھا۔ جارج واشنگٹن کی زندگی کے بہت سے کام جمعہ کو شروع ہوئے یا انجام پائے۔

جمعہ کے دن ـــــ پیدا ہوا۔
جمعہ کے دن ـــــ لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی پائی۔
جمعہ کے دن ـــــ ورجینیا میں فوج کی کمان سنبھالی۔
جمعہ کے دن ـــــ فوج کا کمانڈر ان چیف بنا۔
جمعہ کے دن ـــــ امریکی بحری فوج کی بنیاد ڈالی۔
جمعہ کے دن ـــــ پرنسٹن کی جنگ لڑی۔
جمعہ کے دن ـــــ یارک ٹاؤن کو فتح کیا۔
جمعہ کے دن ـــــ دستوری کانفرس کا صدر منتخب ہوا۔
جمعہ کے دن ـــــ محکمۂ جنگ کی بنیاد ڈالی۔
جمعہ کے دن ـــــ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کی بنیاد ڈالی۔
جمعہ کے دن ـــــ اپنی کابینہ کے پہلے افسر کا تقرر کیا۔
جمعہ کے دن ـــــ وفاقی دارالحکومت کی بنیاد ڈالی۔
جمعہ کے دن ـــــ وہائٹ ہاؤس کا سنگِ بنیاد رکھا۔
جمعہ کے دن ـــــ دورِ صدارت ختم ہوا۔
جمعہ کے دن ـــــ دوبارہ کمانڈر انچیف بنا۔

مرسلہ: ...... شیخ محمد عاکف حمید، کاموکے

بات ہے تو مجھے ضرور بتایئے، میں بھی تو آپ کی وزیر ہوں۔"

اپنی بیوی کی یہ بات سن کر وزیر کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ آگئی۔ اسے یہ وزیر ہونے کی بات بہت اچھی لگی۔ بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ہاں جی اس میں تو شک نہیں کہ آپ ہماری وزیر ہیں لیکن مشکل ایسی آ پڑی ہے کہ آپ کا مشورہ کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔"

"پھر بھی بتایئے تو۔ خدا کی بڑی شان ہے۔ وہ چھوٹے سے دماغ میں بھی بڑی بات ڈال دیتا ہے۔" بیوی نے خوش دلی کے انداز میں کہا۔

اپنی بیوی کی یہ بات سن کر وزیر کے ذہن کا بوجھ جیسے کم ہو گیا۔ مُسکراتے ہوئے بولا۔ "ارے صاحب، آپ اپنے دماغ کو چھوٹا کیوں کہتی ہیں۔ یہ تو ماشاء اللہ اتنا بڑا ہے کہ پورے خاندان پر حکومت کر رہا ہے۔ ہم سے واقعی غلطی ہوئی۔ ہمیں آپ کو اپنی پریشانی کی وجہ بتانی چاہئے تھی۔ بہر حال لیجئے اب بتاتے ہیں۔" یہ کہہ کر وزیر نے بادشاہ کی نرالی بیماری اور اس کے علاج کے بارے میں کی گئی کوششوں کا سارا حال سنا دیا۔

بیوی خوش ہو کر بولی۔ "میری بات سچی نکلی نا۔ اگر آپ پہلے اپنی پریشانی کا حال بتا دیتے تو اب تک آپ کے بادشاہ صحت کا غسل کر چکے ہوتے۔ بات اتنی سی ہے نا کہ اگر کوئی ایسا آدمی دُعا کرے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو تو خدا کے فضل سے ہمارے ملک میں ایسے لاکھوں انسان موجود ہیں۔ میں تو حیران ہو رہی ہوں کہ آپ نے ان سے دُعا کیوں نہیں کرائی!"

"کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟" وزیر نے حیران ہو کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

بیوی نے کہا "کیا آپ کو معلوم نہیں کہ خدا کے فضل سے ہمارے ملک میں لاکھوں بچے ہیں اور بچے معصوم ہوتے ہیں۔ آپ بچوں کی شاندار دعوت کا انتظام کیجئے اور ان سے کہئے وہ بادشاہ سلامت کی صحت کے لئے دُعا مانگیں۔ اُمید کیا یقین ہے کہ اللہ ان کی دُعا قبول کرے گا۔"

اپنی بیوی کی بات سن کر وزیر اُچھل پڑا۔ اس نے اسی دن شاہی باغ میں بچوں کی دعوت کا انتظام کیا۔ ان کے لئے اچھے اچھے کھانوں اور مٹھائیوں کے علاوہ بڑھیا بڑھیا کھلونوں کا انتظام بھی کیا اور پھر ایسا ہوا کہ ان معصوموں کی دُعا سے اللہ پاک نے بادشاہ کو تندرست کر دیا۔

اچھے بچو! یہ تو ایک کہانی تھی۔ لیکن اس بات میں ذرا بھی شک نہیں کہ اللہ پاک ننھے منے معصوم بچوں کی وہ دُعا ضرور قبول کرتا ہے جو وہ کسی اچھے کام کے لئے مانگتے ہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کرنے کی دُعا اس وقت قبول ہوتی ہے جب خوب محنت بھی کی جائے!!۔

مُلک کی خدمت کرنے والے میرا آئیڈیل ہیں

کرکٹر شعیب محمد کی سیدھی شرمیلی شگفتہ گفتگو

سلیم بن خالق

پاکستان میں کسی مشہور شخصیت سے انٹرویو کرنا بہت مشکل کام ہے کیونکہ اکثر لوگ بہت چکر لگواتے ہیں اور بات بھی ٹھیک طرح سے نہیں کرتے۔ اکثر اوقات ملنے کا وقت دے کر کہیں اور چلے جاتے ہیں لیکن شعیب محمد میں ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ بہت بااخلاق اور پُرخلوص انسان ہیں۔ ان سے انٹرویو کرنے کے لئے جب میں نے انہیں فون کیا تو انہوں نے مجھے اسی دن ملاقات کا وقت دے دیا حالانکہ انہیں اسی رات کرکٹ کیمپ میں شرکت کے لئے لاہور جانا تھا۔ جب میں ان سے ملنے کے لئے پہنچا تو وہ میرے منتظر تھے۔ ان کی وعدے کی پابندی کی عادت نے مجھے بہت متاثر کیا۔

شعیب محمد ہماری کرکٹ ٹیم میں جاوید میاں داد کے بعد دوسرے بہترین بیٹسمین (اوسط رن کے لحاظ سے) ہیں جبکہ کرکٹ کی دنیا میں ان کا نمبر ساتواں ہے۔ شعیب کو ون ڈے میچوں میں پاکستان کی جانب سے سب سے زیادہ انفرادی رنز (۱۲۶) بنانے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

وہ ٹیسٹ میچوں میں تقریباً ڈھائی ہزار اور ایک روزہ (ون ڈے) میچوں میں تیرہ سو رنز بنا چکے ہیں۔ اس سال دنیا کے دس بہترین بیٹسمینوں کی فہرست میں ان کا نام آٹھویں نمبر پر لکھا گیا ہے۔

شعیب محمد ۸ جنوری ۱۹۶۱ء کو کراچی میں پیدا

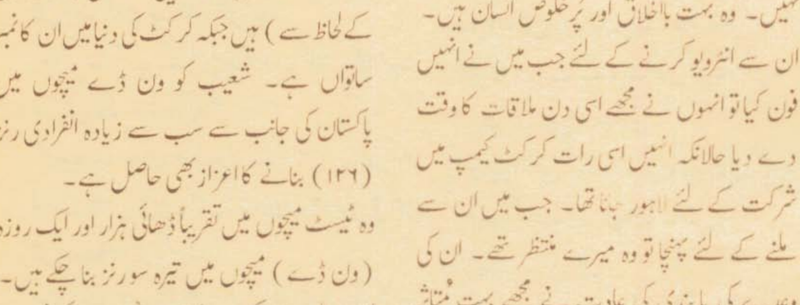

سلیم خالق شعیب محمد سے باتیں کرتے ہوئے

ہوئے۔ ان کے والد مشہور ٹیسٹ کرکٹر حنیف محمد نے ان کی تربیت بھی ایک کرکٹر کے طور پر کی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شعیب نے کالج کی شکل ہی نہیں دیکھی۔ شعیب نے بی ایس سی تک تعلیم حاصل کی ہے۔

اس انٹرویو میں ہم نے شعیب محمد سے آنکھ مچولی کے ساتھیوں کے لئے ہلکے پھلکے سوالات کئے ہیں۔ گفتگو کے دوران قومی کرکٹ ٹیم کے سابق منیجر اور ٹیسٹ کرکٹر حسیب احسن بھی آ گئے اور گفتگو میں ایک آدھ جگہ حصہ بھی لیا۔

سوال :۔ آپ نے اپنا پہلا فرسٹ کلاس میچ کب اور کس کے خلاف کھیلا؟

شعیب :۔ (کچھ سوچتے ہوئے) میں نے اپنا پہلا فرسٹ کلاس میچ بلوچستان کے خلاف ۱۶ سال کی عمر میں ۱۹۷۷ء میں کھیلا۔

سوال :۔ اس میچ میں آپ کی کارکردگی کیسی رہی؟

شعیب :۔ بہت اچھی رہی۔ سو سے اوپر رن بنائے تھے میں نے اس میچ میں۔

سوال :۔ اور پہلا ٹیسٹ کب کھیلا اور اس میں کیسی کارکردگی رہی؟۔

شعیب :۔ پہلا ٹیسٹ میں نے نومبر ۱۹۸۳ء میں بھارت کے خلاف کھیلا اور اس میں میری کارکردگی زیادہ اچھی نہیں رہی۔

سوال :۔ شعیب بھائی! .... آپ نے کرکٹر بننے کا فیصلہ خود کیا یا والد صاحب کی خواہش تھی؟

شعیب :۔ دیکھیں جی! کرکٹ دراصل ہمارا خاندانی گیم ہے۔ میرے چچا بھی ٹیسٹ کرکٹ کھیل چکے ہیں خود میرے والد حنیف محمد اچھے کرکٹر رہ چکے ہیں۔ اس لئے میں اپنے کرکٹ کھیلنے کا کریڈٹ اپنے والد بلکہ اپنی پوری فیملی کو دوں گا۔

سوال :۔ کوئی ایسا میچ جو آپ کی شہرت کا باعث بنا ہو؟

شعیب :۔ ایسے تو بہت سے میچ ہیں۔ لیکن ۱۹۸۷ء میں ویسٹ انڈیز کے خلاف جو سیریز ہم نے کھیلی وہ میرے لئے بہت اچھی ثابت ہوئی۔ میری شہرت اسی سیریز سے ہوئی۔

حسیب احسن :۔ دو سینچریاں کی تھیں شاید شعیب تم نے اسی دورے میں۔

شعیب :۔ جی ہاں

سوال :۔ آپ کے نزدیک قابلِ احترام لوگ کون ہیں؟

شعیب :۔ ہر انسان، بچّہ، بوڑھا سب لوگ۔

سوال :۔ کیا آپ اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن ہیں؟

شعیب :۔ دیکھئے جی کوئی بھی انسان کبھی بھی اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہوتا ہے وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے اور اپنی موجودہ زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ویسے اللہ کا شکر ہے کہ میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں۔

سوال :۔ شعیب بھائی آپ خود تو بہت سے لوگوں

کے آئیڈیل ہیں، آپ کا آئیڈیل کون ہے؟
شعیب :۔ ہر وہ انسان جو اچھے کام کرے اور اپنے ملک کی خدمت کرے، قوم کا نام روشن کرے۔ جس میں بہت سے خوبیاں ہوں، وہ میرا آئیڈیل ہے۔

سوال :۔ کرکٹ کے علاوہ آپ کو کونسا کھیل پسند ہے؟
شعیب :۔ میں نے اسکول کی حد تک ہاکی کھیلی ہے اس لئے مجھے ہاکی بھی پسند ہے۔

سوال :۔ کوئی ایسی شخصیت جس کی یاد آپ کو اکثر آتی ہو اور آپ افسردہ ہو جاتے ہوں؟
شعیب :۔ جی ہاں میری پردادی، وہ مجھے اکثر یاد آتی ہیں۔

سوال :۔ آپ کے سب سے بہترین دوست کون کون ہیں۔
شعیب :۔ رفیق، شاہد اور فاروق میرے بہترین دوست ہیں۔

سوال :۔ اور پاکستانی کرکٹ ٹیم میں؟
شعیب :۔ پاکستانی ٹیم کا ہر کھلاڑی میرا دوست ہے۔

سوال :۔ کرکٹ میں آپ کے پسندیدہ کھلاڑی؟
شعیب :۔ سُنیل گواسکر اور ویوین رچرڈز۔

سوال :۔ اور آج کل جو کھیل رہے ہیں ان میں؟
شعیب :۔ آج کل جو کرکٹرز کھیل رہے ہیں ان

شعیب محمد دو عظیم کرکٹرز جاوید میانداد
اور اقبال قاسم کے ساتھ

میں نیوزی لینڈ کے مارٹن کرو اور انگلینڈ کے رابن اسمتھ مجھے پسند ہیں۔

سوال :۔ آپ کو کونسا لباس پسند ہے ؟
شعیب :۔ جین کی پینٹ مجھے کافی پسند ہے۔ اس کے علاوہ کُرتا پاجامہ اور شلوار قمیض بھی پسند کرتا ہوں۔

سوال :۔ کیا آپ نماز پڑھتے ہیں ؟
شعیب :۔ جی ہاں! اللہ کا شکر ہے پانچوں وقت کی نماز پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

سوال :۔ آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟

شعیب :۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ایک تو یہ ہے کہ میں کرکٹ میں ریکارڈز بناؤں جبکہ دوسری خواہش یہ ہے کہ اپنے بیٹے شہزاد کو کرکٹر بناؤں۔

سوال :۔ پاکستان میں آپ کا پسندیدہ شہر کونسا ہے؟

شعیب :۔ اپنا خوب صورت شہر کراچی مجھے بہت پسند ہے۔

سوال :۔ کونسا اخبار آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے؟

شعیب :۔ انگریزی اخبار "ڈان"۔

سوال :۔ اخبار کا کونسا صفحہ سب سے پہلے پڑھتے ہیں؟

شعیب :۔ اسپورٹس کا۔

سوال :۔ اچھا شعیب بھائی! اس سوال کا جواب ذرا سچ سچ دیجئے گا۔ طالب علمی کے زمانے میں کس مضمون سے نفرت تھی؟

شعیب :۔ (کچھ سوچنے کے بعد مسکراتے ہوئے) سب مضمونوں سے نفرت تھی (قہقہہ) خیر یہ تو مذاق کی بات ہے ویسے کوئی خاص مضمون ایسا نہیں تھا جس سے مجھے نفرت ہو۔

سوال :۔ اپنی کونسی عادت آپ کو بہت پسند ہے؟

شعیب :۔ لوگوں کی پیٹھ پیچھے ان کی برائیاں نہ کرنا۔

سوال :۔ آپ کو دنیا کی کتنی زبانوں پر عبور حاصل ہے؟

شعیب :۔ صرف دو، اردو اور انگریزی۔

سوال :۔ آپ کی زندگی کا خوب صورت ترین دن؟

شعیب :۔ بہت سے ہیں۔ ان میں سے ایک میرے بیٹے شہزاد کی پیدائش کا دن ہے۔

سوال :۔ کوئی ایسی خواہش جو غیر متوقع طور پر پوری ہوئی ہو؟

شعیب :۔ جی ہاں میری پہلی ٹیسٹ سینچری جب بنی تو مجھے اُمید نہیں تھی کہ اتنی جلدی میں سینچری بنالوں گا۔

سوال :۔ وہ کون سی دُعا ہے جو ہر وقت آپ کے لب پر رہتی ہے؟

شعیب :۔ اے اللہ میرے گھر والوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھ۔

سوال :۔ بچپن میں شرارتیں کرتے تھے؟

شعیب :۔ جی ہاں مگر آج کل کے بچوں کی طرح نہیں (مُسکراتے ہوئے)۔

سوال :۔ محبت، دولت اور شہرت میں سے آپ کا انتخاب کیا ہوگا؟

شعیب :۔ شہرت۔

سوال :۔ دنیائے کرکٹ کے کس بولر کو کھیلنا آپ کو مشکل لگا؟

شعیب :۔ میلکم مارشل ایک مشکل ترین بولر تھے۔

سوال :۔ کرکٹ کا کونسا گراؤنڈ آپ کو پسند

ہے؟

شعیب :۔ آسٹریلیا کے سبھی گراؤنڈز خصوصاً ایڈیلیڈ مجھے پسند ہے۔

سوال :۔ آٹو گراف بک میں آپ کیا لکھتے ہیں؟

شعیب :۔ نیک تمناؤں کے ساتھ (انگریزی میں)۔

سوال :۔ آپ کے خیال میں سائنس کی کون سی ایجاد بہترین ہے؟

شعیب :۔ کوئی ایجاد بیکار نہیں ہے۔ ہر ایجاد کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے اور ہر ایجاد کی اپنی اہمیت ہے اس لئے سب ایجادات بہترین ہیں۔

سوال :۔ اگر آپ کو کرکٹ ٹیم کا کپتان بنا دیا جائے تو؟

شعیب :۔ اس بارے میں ابھی سوچا نہیں ہے۔

سوال :۔ آپ اپنے بیٹے کو کیا بنائیں گے؟

شعیب :۔ کرکٹر۔ انشاءاللہ! ویسے شہزاد کو مجھ سے زیادہ کرکٹ کھیلنے کا شوق ہے۔

سوال :۔ آپ کس ٹیم کے خلاف کھیل کر خوشی حاصل کرتے ہیں؟

شعیب :۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے میں بھارت کا نام لوں گا کیونکہ یہ ہماری روایتی حریف ٹیم ہے اور پھر ویسٹ انڈیز کیونکہ جو کھلاڑی ویسٹ انڈیز کے خلاف اچھا کھیلے اس کی زندگی بن جاتی ہے۔

سوال :۔ کن ممالک میں کھیلنے میں دشواری ہوتی ہے؟

شعیب :۔ آسٹریلیا میں۔ کیونکہ وہاں کی وکٹیں باؤنسی ہوتی ہیں جبکہ ہم پاکستان میں سُست وکٹوں پر کھیل کر ایسی ہی وکٹوں کے عادی ہو جاتے ہیں اس لئے وہاں پر اکثر ہماری بیٹنگ فلاپ ہو جاتی ہے۔

سوال :۔ جاوید میاں داد کو کپتانی سے ہٹانے کے فیصلے پر آپ کی رائے؟

سوال :۔ یہ کرکٹ بورڈ کا فیصلہ ہے اور انہوں نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہو گا۔ ہم کھلاڑی اس معاملے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔

سوال :۔ آنکھ مچولی کے ان قارئین کے لئے جو کرکٹ میں دلچسپی رکھتے ہیں .... آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟

شعیب :۔ جی ہاں! کیوں نہیں۔ نوجوانوں کے لئے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ وہ اپنے پسندیدہ کھلاڑیوں کے کھیل سے سیکھنے کی کوشش کریں۔ ان کے اسٹروکز، اسٹائل وغیرہ غور سے دیکھیں کیونکہ دیکھنے سے آدمی جلدی سیکھ جاتا ہے۔

سوال :۔ آنکھ مچولی کے سب قارئین کے لئے آپ کا پیغام؟

شعیب :۔ جی ہاں قارئین کے لئے میرا پیغام یہ ہے کہ کھیل کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی کیجئے اور بزرگوں کا احترام کیجئے کیونکہ آدمی کو دنیا میں اسی سے عزت ملتی ہے اور اللہ کی عبادت کرنا کسی حال میں نہ بھولیے۔

بوجھو تو جانیں

ادارہ

۱)۔ ننھی سی جاں کا ہے کیسا کمال، بنایا ہے ریشوں کا پیارا سا جال
سلائی میں اس کے سوئی نہ لگے، کوئی اس کو ہرگز پہن نہ سکے

۲)۔ ہے کہنے کو بےجان اور بےزباں، مگر حال کرتا ہے سارا بیاں
ذریعہ ہے آدھی ملاقات کا، ملاتا ہے رشتہ مقامات کا

۳)۔ ہاتھ میں لے کر ذرا گھمایا، گول بنا کر اسے دبایا
ہو جائے جب چوڑا چکلا، انگاروں پر اسے نچایا

۴)۔ گھر شیشے کا اور دو یار، دونوں کا آپس میں پیار
چلتے رہنا ان کا کام، چلنے میں ہیں وہ ہوشیار

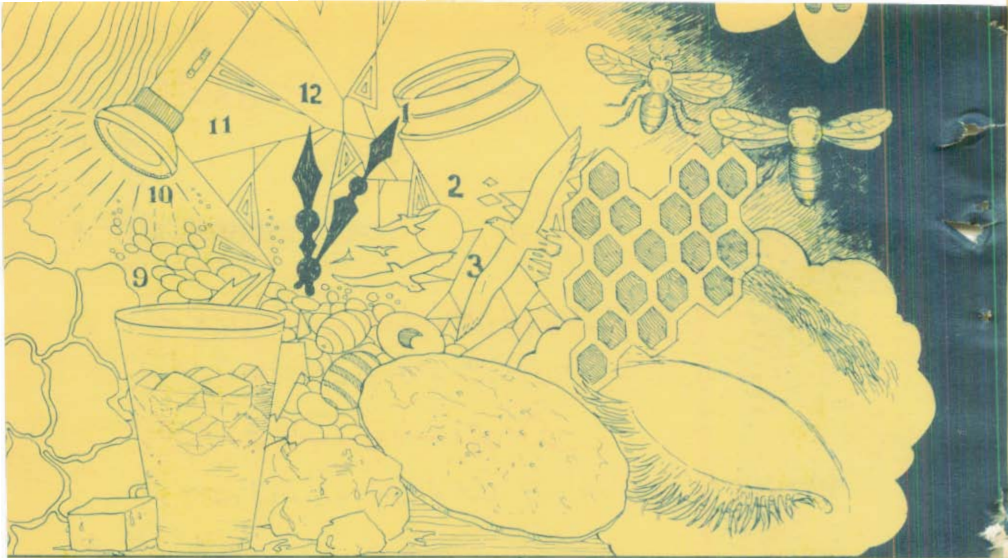

۵)۔ دیکھا ایسا اک دربار، لاکھوں جس کے پہرے دار
لے کر بیٹھیں ہیں ہتھیار، ان سے تم رہنا ہوشیار

٦)۔ گرمی میں وہ آتی ہے، ہر گھر میں وہ جاتی ہے
تول میں پوری لے کر آئے، لاتے لاتے وہ گھٹ جائے

۷)۔ ایک جگہ پر بانس بریلی، ایک جگہ ہے کنواں
ایک جگہ پر آگ لگی ہے، ایک جگہ ہے دھواں

۸)۔ تین حرفوں میں میرا نام، کھانے کے میں آؤں کام
الٹا سیدھا ایک سمان، نہ میں لڈو نہ میں پان

۹)۔ پانی کا ہے ایک درخت، ہراک کو وہ بھائے
چھاؤں ہے اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی، کوئی بیٹھ نہ پائے

۱۰)۔ دو کبوتر پیارے پیارے پر ہیں ان کے کالے
چال ہیں ان کی اونچی نیچی، رب ہے ان کو پالے

گزشتہ ماہ کی پہیلیوں کے درست جوابات

۱۔ بچھو ۲۔ اگال دان ۳۔ گھڑی کی سُوئیاں ۴۔ بُھٹا
۵۔ لوٹا ۶۔ ہنڈیا اور چمچہ ۷۔ قلم ۸۔ لٹو
۹۔ آٹا گوندھ کر روٹی پکانا ۱۰۔ چھتری ۱۱۔ آکسیجن

قرعہ اندازی کے ذریعہ انعامات حاصل کرنے والے ساتھی :

۱۔ نعمان احمد خان، کراچی ۲۔ زبیر احمد خان، کراچی ۳۔ تابندہ ریاض، لاہور۔

بالکل دُرست جواب دینے والے ذہین ساتھی :

شاکر عنائت، ٹنڈوالہ یار۔ اشفاق احمد قریشی، حیدر آباد۔ بابر کمال، راولپنڈی۔ اُسامہ آصف حسن، کراچی۔

ایک غلطی کرنے والے ساتھی :

ابن رضا، لاہور۔ سید عرفان علی، حیدر آباد۔ محمد کامران ایوب، کراچی۔ اقرار حسین اعوان، چکوال۔ محمد عمران، لاہور۔ محمد کامران، لاہور۔ انعم آصف، لاہور۔ محمودہ صدّیقی، لاہور۔ جواد محبّ، گوجرانوالہ۔ حمّاد علی فیصل، کراچی۔ ناہید اختر، لاہور۔ خان زادی شیخ، محمد عاطف صدیقی، کراچی۔ شاہینہ شیخ، حیدر آباد۔ نائلہ صبا صابر، حیدر آباد۔ محمد سعید میاں، لاہور۔ مہوش، واہ کینٹ۔ فرخ منیر، مرید کے۔ آصف وقار آصف، واہ کینٹ۔ محمد لطیف، شیخوپورہ۔

ایک سے زیادہ غلطیاں کرنے والے ساتھی :

عمّارہ مبین، لاہور۔ نجمہ شریف، سکّھر۔ انجم رضا اعوان، چکوال۔ محمد علی جواد، لاہور۔ ادیب فاطمہ، سکّھر۔ چوہدری محمد قاسم گورایہ، چوہدری حماد الرحمٰن گورایہ، چوہدری رضوان احمد گورایہ، چوہدری سرور گورایہ، گوجرانوالہ۔ مسز فیاض، لاہور۔ سعید انور، لاہور۔ ارم فاطمہ، سکّھر۔ مبین اختر غوری، کراچی۔ اسما محمد شاہد، کراچی۔ محمد ثاقب حبیب، حیدر آباد۔ عابد رشید، لاہور۔ محمد عابد آفریدی، کوہاٹ۔ افتخار احمد شیرازی، ٹنڈو آدم۔ سعدیہ فیض، کراچی۔ نادیہ فیض احمد، کراچی۔ محمد حسیب الرحمٰن، لاہور۔ الطاف حسین، بوریوالہ۔ عبد الستار خان طاہر، بوریوالہ۔ برکت علی ہزارہ، سانگھڑ۔ صائمہ دلدار، جھمرہ سٹی۔ ماریہ زیدی، راولپنڈی۔ عمّاد فاروق خان، سکّھر۔

آنکھ مچولی البم

بہت خوب!.... آپ اب تک نہیں بکے؟

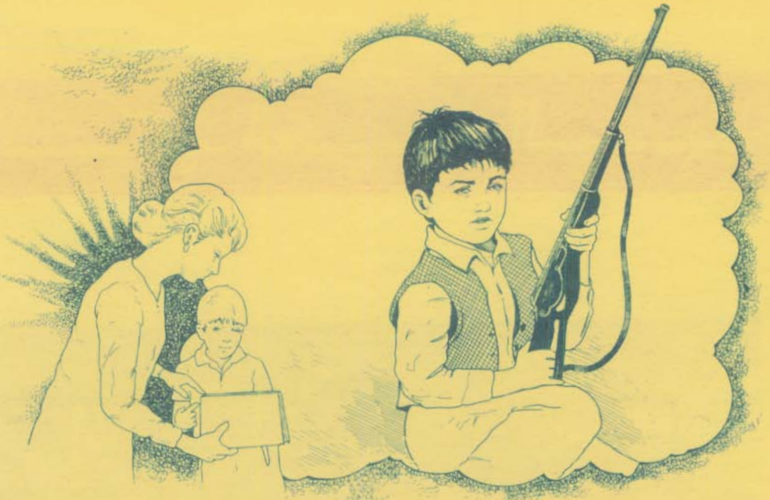

ننھا مُجاہد

منوّر علی چشتی

ننھا مُنا ایک مجاہد — کہتے ہیں سب جس کو زاہد
اک دن امّی جان سے بولا — بھید یہ اپنے دل کا کھولا
امی جنگ میں جاؤں گا میں — باطل سے ٹکراؤں گا میں
دشمن کو برباد کروں گا — اپنا دل یوں شاد کروں گا
امّی اک بندوق منگاؤ — اس سے میری شان بڑھاؤ
امّی بولیں پیارے بیٹے — اچھے ہیں جذبات تمہارے
لیکن تم ہو بھولے بھالے — ننھے منّے پیارے پیارے
مشکل ہے بندوق چلانا — ناحق ہے یوں جنگ میں جانا
محنت صبح و شام کرو تم — اچّھے. اچّھے کام کرو تم
جب اس قابل ہو جاؤ گے — رائفل لے کر خود آؤ گے
شوق سے پھر تم توپ چلاؤ — ہر دشمن کو مار بھگاؤ
کفر کا سارا زور مٹاؤ — پرچمِ اسلامی لہراؤ

جہانگیر

سیما صدیقی

حال ہی میں مس آمنہ کا بطورِ "انچارج" اس اسکول میں تبادلہ ہوا تھا۔ مس آمنہ ایک پُختہ عمر اور ٹھنڈے مزاج کی خاتون تھیں۔ پہلے دن انہوں نے اسٹاف کے ساتھ تعارفی میٹنگ رکھی۔ اگلے دن انہوں نے کلاسوں کا اچانک معائنہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ دیکھ کر ان کا جی خوش ہو گیا کہ کلاسوں کا ماحول مثالی تھا۔ تدریس نہایت منظّم اور پُرسکون انداز میں جاری تھی۔ ٹیچرز کا رویّہ مشفقانہ دکھائی دیتا تھا لیکن جب وہ فائیو بی کے دروازے پہ پہنچیں تو جہاں کی تہاں رہ گئیں، ایک لڑکا مُرغا بنا کھڑا تھا اور ٹیچر اس پر مشینی انداز میں اسکیل برسا رہی تھی۔ مس آمنہ نہ صرف ٹیچر کی سنگ دلی پہ دنگ تھیں بلکہ لڑکے کی خوش طبعی پہ بھی حیران تھیں کیونکہ جتنا وہ مارتی تھیں اتنا ہی وہ ہنستا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے نیا آئٹم پیش کرتے ہوئے ککڑوکوں ...... ککڑوکوں ...... کی آوازیں نکالنی

شروع کر دیں۔ مس آمنہ نے بچّوں کے سامنے سرزنش مُناسب نہ سمجھی اور ٹیچر کو آفس میں طلب کر لیا۔

"مس فریدہ! کیا آپ جانتی ہیں کہ بچّے کے اوّلین حقوق کون سے ہیں؟" مس فریدہ خاموشی سے میڈم کو خالی خالی نگاہوں سے دیکھتی رہیں تو میڈم نے خود ہی کہا"پیار اور محبّت بچّے کے بنیادی اور اوّلین حقوق میں شامل ہے۔ تعلیم ہو یا تربیت، بچّہ پیار پہچانتا ہے اور پیار ہی سے مانتا ہے۔ پٹ پٹ کر تو بچّے ڈھیٹ ہو جاتے ہیں۔ ویسے بھی بچّوں پر اسکیل اُٹھانا اور انہیں زدوکوب کرنا اسکولوں میں جُرم قرار دیا جاچکا ہے ......"

مس فریدہ نے بے زاری سے اسکیل ایک طرف رکھتے ہوئے کہا " آہ! کبھی ہمارے بھی ایسے ہی خیالات تھے ...... اس لڑکے بلکہ اس فتنے کا نام "جہانگیر" ہے یہ پورے اسکول کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اسے بیک وقت "جنگلی تہذیب کا نمائندہ" "شیطان کا چیلہ" "ڈرامہ" اور"ایب نارمل" کے متنوع خطابات مل چکے ہیں۔ معلوم نہیں کیسے پہلی جماعت سے ایک بلا کی طرح میرا تعاقب کرتا ہوا پانچویں تک پہنچ گیا ہے۔ جتنی محبّت میں نے جہانگیر کو دی ہے اتنی اگر میں کسی بندر کو دیتی تو وہ بھی اب تک جہانگیر بن چکا ہوتا مگر یہ جہانگیر کا جہانگیر ہی رہا۔" اس کے بعد انہوں نے جہانگیر کے غیر معمولی کارناموں کی تفصیل بتانی شروع کی جن میں بچّوں کو مار کر بُھرتا بنانا، بچّوں کے کپڑوں میں پٹاخے باندھ کر دھماکے کرنا، بچّوں پر پانی پھینکنا اور پھر انہیں نچوڑنا، ٹیچروں کے دوپٹے کرسی سے باندھ دینا، گیٹ کود کر بھاگنا اور چوکیدار کو دوڑانا اور سر کے بل کھڑے ہونے کی کوشش کرنا جیسے خاص خاص مشاغل شامل تھے۔

"پیار سے لے کر مار تک ہر طریقہ آزمایا جاچکا ہے۔ مگر پیار سے یہ مزید سر چڑھ جاتا ہے اور مار کا اس پہ اثر نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں کس ڈھیٹ "مٹّی سے بنا ہے۔" ٹیچر نے آخر میں مایوسی سے کہا تو مس آمنہ نے حیرت سے آنکھیں جھپکا کر کہا "ارے تو آخر اسے اسکول سے نکال کیوں نہیں دیا جاتا، اس کی وجہ سے اسکول کا ڈسپلن تباہ ہو رہا ہے۔"

"جی ہاں!" مس آمنہ نے سر ہلایا "ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرتی ہے مگر اس مچھلی کو تالاب سے نہیں نکالا جا سکتا کیوں کہ ایک بڑا مگرمچھ اس کا چچا ہے!"

"ہوں! ! خیر ...... پہلی بات تو آپ یہ سمجھ لیں کہ جہانگیر یہ سب کچھ "توجّہ" حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے ......"

"توجّہ!! غضب خدا کا ...... ہیڈ مسٹریس سے لے کر گیٹ کیپر تک سب کے سب تو اس کی طرف متوجّہ ہیں ...... آخر اسے کتنی توجّہ در کار ہے؟"

"دیکھئے! ایسے شیطان بچّوں کو کوئی ذمّہ داری کا کام سونپ دیا جائے تو وہ احساسِ ذمّہ داری کے تحت خود ہی سنبھل جاتے ہیں۔ مثلاً کسی بچے کو چوری کی عادت پڑ رہی ہو تو اسے خزانچی بنا دیا جائے۔ اسی طرح شریر بچّے کو کلاس کا مانیٹر بنا دیا جائے۔ میرا خیال ہے جہانگیر کو بھی ہمیں مانیٹر بنا دینا چاہئے۔"

اگلے دن سارے اسکول میں چرچا تھا کہ جہانگیر مانیٹر بن گیا ہے۔ مس آمنہ جب پانچویں پیریڈ میں راؤنڈ پہ پہنچیں تو دھک سے رہ گئیں۔ بچّے تقریباً ادھ موئے پڑے تھے۔ جہانگیر نے بچّوں کو مار مار کر ڈھیر کیا ہوا تھا۔ "اوہ میرے خدا!" مس آمنہ کی آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ "بیٹا یہ آپ نے کیا کیا؟" انہوں نے پوچھا تو جہانگیر نے دانت نکال کر ہنستے ہوئے کہا "میڈم! یہ لوگ خاموش ہی نہیں ہو رہے تھے۔" (یہ وہی ہنسی تھی جس نے جہانگیر کو ایب نارمل، مشہور کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔)

مس آمنہ کو سخت صدمہ ہوا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ ان کے نفسیاتی طریقۂ کار کا یہ انجام ہو گا۔ انہوں نے ایک بچّے کو اٹھایا، انہیں خدشہ ہوا کہ کہیں جہانگیر نے بچّوں کو ہمیشہ کے لئے خاموش نہ کر دیا ہو۔

جہانگیر کا بڑا بھائی میٹرک میں تھا اور اسی اسکول کی دوسری برانچ میں پڑھتا تھا۔ مس آمنہ نے ہمّت نہ ہاری۔ انہوں نے جہانگیر کے بھائی کو بلوایا۔ وہ اس کا خاندانی پسِ منظر اور گھریلو حالات جاننے کی خواہش مند تھیں تاکہ جہانگیر کے مرض کی جڑ کو پکڑ سکیں۔

اس وقت جہانگیر کا بھائی بابر ان کے سامنے بیٹھا تھا اور اسے دیکھ کر مس آمنہ پہ منکشف ہوا کہ جہانگیر بیچارہ تو بہت کم کھسکا ہوا تھا (اپنے بھائی کے مقابلے میں) بھائی ان لوگوں میں سے تھا جو خود ہی بات کر کے خود ہی ہنستے ہیں خواہ بات ہنسنے کی ہو یا نہ ہو۔ بہن بھائیوں کی تعداد کے سوال پر اس نے ہنسی سے بے حال ہوتے ہوئے بتایا "چار بھائی...... تین بہنیں......! ہی ہی...... وہ جی جہانگیر بس ایسا ہی ہے...... کل تو اس نے ڈنڈا مار کر پنکھا توڑ دیا...... ہی ہی ہی...... ویسے تو امّی اس کو کبھی ڈانٹتی نہیں...... مگر کل بہت ڈانٹ پڑی جی۔" "کیوں! کل کیوں ڈانٹ پڑی؟" مس آمنہ نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"وہ جی پنکھا امّی کے اوپر ہی گرا تھا نہ جی...... ہی ہی!"

"کیا!!" مس آمنہ دھک سے رہ گئیں۔ تھوک نگل کر بولیں...... "اچھا کل اپنی والدہ کو لے کر آیئے...... میں ان سے ملنا چاہتی ہوں......"

جہانگیر کی والدہ بظاہر معقول قسم کی خاتون لگ رہی تھیں...... ایسے عجیب و غریب بچّوں کی والدہ

ہونے پر چاہئے تو یہ تھا کہ انہیں کوئی ایوارڈ دیا جاتا مگر مس آمنہ نے اسکول میں جہانگیر کی شر انگیز سرگرمیوں کا نقشہ کھینچ کر انہیں ہراساں کرنے کی کوشش شروع کر دی۔"اب آپ ہی بتائیے ...... جہانگیر ایسی حرکتیں کیوں کرتا ہے؟"

"وہ جی!!" جہانگیر کی امی نے راز دارانہ انداز میں سرگوشی کی ...... "دراصل بچپن میں ایک بار مغرب کے وقت جہانگیر اپنی واکر میں چھت پہ پڑا رہ گیا تھا۔ (معلوم نہیں یہ بچّہ تھا یا کپڑا جو چھت پر پڑا رہ گیا) خوبصورت تو یہ بچپن ہی سے بہت ہے۔ بس اوپری اثر ہو گیا اس پر...... سمجھ رہی ہیں نا آپ "اوپری اثر۔" "جی ہاں کیوں نہیں! اوپری اثر یعنی اوپر کی آب وہوا کا اثر، اندھیرے، ٹھنڈی ہوا اور اوس وغیرہ کا اثر ہو گیا ہو گا ......"

"ارے نہیں جی! اوپری اثر، یعنی آسیب کا اثر ...... بس جی کیا بتاؤں ہمارے گھر کے باہر ایک آسیب زدہ نیم کا درخت ہے جس کی شاخیں ہماری چھت تک آتی ہیں۔ اب تو یہ حال ہے کہ جس بستر پہ سوتا ہے وہ آپ ہی آپ سرکتا رہتا ہے۔ (مس آمنہ نے بعد میں نوٹ کیا وہ واقعی اپنی کمر بینچ سے ٹکا کر پاؤں آگے پھیلا کر نہایت غیر محسوس طریقے سے ڈیسک کھسکانے کا ماہر تھا) پانچ پانچ کلو تربوز اکیلے کھا جاتا ہے۔ مار کا اس پر اثر نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی عجیب وغریب زبان بولنے لگتا ہے۔ جھاڑ پھونک کے لئے پیر صاحب کے پاس لے گئی تھی۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ایک جن ہمہ وقت جہانگیر کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور جہانگیر سے غلط سلط کام کرواتا ہے ......" مس آمنہ کو لگا کہ "اوپری اثر" جہانگیر پر ہوا ہو یا نہ ہو لیکن اس کی امّی پر ضرور ہو گیا ہے۔ چنانچہ ان سے مایوس ہو کر انہوں نے کہا کہ آپ برائے مہربانی جہانگیر کے والد صاحب کو بھیج دیجئے گا۔

اس وقت ایک نئے عزم سے مس آمنہ جہانگیر کے والد کے سامنے بیٹھی تھیں۔ والد صاحب نے بیزاری سے کندھے اُچکائے اور مس آمنہ سے کہا۔ "بھئی یہ سب وہی پرانی شکایتیں ہیں یہ سب سُن سُن کر تو میں عاجز آگیا ہوں یقین کیجئے! اتنی بار تو میں اپنے زمانۂ طالبِ علمی میں اسکول نہیں گیا جتنی بار جہانگیر کی شکایت سننے کے لئے اسکول بلوایا گیا ہوں۔ شروع میں جہانگیر فیل ہوتا تھا تو میں اسکول بدلوا دیتا تھا (ظاہر ہے دماغ تو بدلوانے سے رہے) اب تو ٹیچریں خود ہی اسے پاس کر کے اگلی جماعت میں بھیج دیتی ہیں۔ (اسی میں ان کی عافیت جو ہے) میں تو اس کی تربیت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں۔ سائیکل کی چین سے پٹائی لگاتا ہوں۔ کئی بار ٹینک میں بھی لٹکا چکا ہوں۔ مگر نتیجہ صفر ہی رہا۔ والد صاحب نے اپنی خدمات بیان کیں۔ (اب معلوم ہوا کہ جہانگیر پر مار کا اثر کیوں نہیں ہوتا تھا۔ والدہ کا خیال تھا کہ یہ جنّاتی اثر ہے حالانکہ یہ آبائی اثر تھا)

جہانگیر کے والد سے مل کر مس آمنہ کو شدید مایوسی ہوئی۔ وہ ان ماں باپ میں سے تھے جو مہینوں بچّوں کو پوچھتے نہیں کہ بچے کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں اور پھر ایک دن اچانک اُٹھ کر ان کی دھنائی کر دیتے ہیں۔

جہانگیر کے والد نے یہ اُمید افزا انکشاف کیا کہ ایک ایم، اے، نفسیات صاحب جہانگیر کو ٹیوشن پڑھاتے ہیں۔ مس آمنہ جان چکی تھیں کہ یہ جنّاتی نہیں بلکہ نفسیاتی کیس ہے۔ لہٰذا انہوں نے جہانگیر کے ٹیوٹر کو بُلوا لیا۔

ٹیوٹر صاحب کی عینک بار بار سرک کر ناک پہ آ رہی تھی اور وہ مسلسل اسے اُنگلی سے سرکا کر آنکھ پہ ٹِکانے کی کوشش کر رہے تھے۔ معلوم نہیں کیوں وہ مس آمنہ کو دیکھنے کے بجائے ان کی عقب میں موجود دیوار کو دیکھے جا رہے تھے۔ (خدا جانے یہ جنّاتی اثر تھا یا جہانگیری!)

"محترمہ! جہانگیر نہایت ہی اسپیشل اور حسّاس بچّہ ہے۔ میں اس کے والد کو بھی منع کرتا ہوں کہ مار پیٹ سے گریز کریں۔ اسکول میں بھی اسے خوشگوار ماحول فراہم کیا جائے۔ آپ یوں کیجئے کہ ...... جہانگیر جب بھی کوئی بدتمیزی کرے یا اوٹ پٹانگ حرکت کرے تو آپ فوراً اس کے برابر بیٹھے بچے کو تھپڑ رسید کریں۔ اس طرح اسے ندامت کا احساس ہوگا اور اس ان ڈائریکٹ نفسیاتی طریقے کے تحت بہت جلد اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہونے لگے گا" "ہوں! عمدہ طریقہ ہے ...... بس اس کے لئے ...... ہمیں آپ کا بچّہ درکار ہوگا ...... تاکہ ہم اسے جہانگیر کے برابر میں بٹھا سکیں ......" مس آمنہ نے پُرسکون انداز میں کہا۔

"جی!!" ٹیوٹر صاحب کی عینک بوکھلاہٹ میں بالکل ہی گر پڑی اور اب مس آمنہ سر تھامے بیٹھی سوچ رہی تھیں کہ "ایب نارمل" کون ہے؟

ہماری کہانی اوروں کی زبانی

ملکہ وکٹوریہ دنیا کے پانچویں حصے پر حکمران تھی۔ ایک روز اس نے اپنے اتالیق اور وزیرِ اعظم لارڈ ملبورن سے دریافت کیا کہ آپ نے تاریخ عالم کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں آپ کو سب سے حیرت انگیز بات کیا نظر آئی۔ لارڈ ملبورن نے بلا تامل جواب دیا۔ "اسلام کا عروج۔" اس پر ملکہ نے سوال کیا کہ آپ نے اس کے اسباب پر بھی غور کیا؟ اس نے کہا میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے کہ ان کے پیغمبر نے انہیں ہدایت کے لئے ایک کتاب (قرآن مجید) دی تھی۔ جب تک وہ اس پر عمل پیرا رہے. ترقی کی تمام راہیں ان پر کھلی رہیں۔ پھر جیسے ہی انہوں نے اس سے بے رخی برتنا شروع کی، ان کا زوال ہونے لگا۔ اگر کسی زمانے میں تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا اور مسلمان نے ایک قوم کی حیثیت سے پھر قرآن مجید کو مضبوطی سے پکڑا اور اپنی انفرادی اور قومی زندگی اس کے مطابق بنا لی تو پھر ہم تو کیا، ساری دنیا ان کے زیر نگیں آجائے گی۔

مرسلہ: غلام عباس طاہر، جھنگ۔

فلاسک کی کہانی

جدید قسم کا فلاسک یا تھرماس پہلی بار ۱۸۹۲ء میں اسکاٹ لینڈ کے طبیعیات دان "سر جیمز ڈیور" نے بنایا تھا۔ وہ لندن کے رائل انسٹی ٹیوٹ میں مائع اور گیس کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ سر جیمز نے ایک شیشہ ساز "رینولڈ برجر" کی مدد سے دہری دیوار والے شیشے کے برتن بنائے اور اس کی اندرونی دیواروں پر پارے کی پالش کر دی۔ اس کے بعد دونوں دیواروں کے درمیان سے ہوا نکال کر دیواروں کے درمیان خلا پیدا کیا گیا جس سے جدید طرز کا فلاسک ابتدائی طور پر تیار ہو گیا۔

فلاسک میں اگر گرم مائع (چائے) یا ٹھنڈا مائع (پانی) ڈال دیا جائے تو اس کا درجۂ حرارت مستقل رہتا ہے جس کی وجہ سے مائع اپنی اصلی حالت میں ہی رہتی ہے۔

اس کی سائنسی وجہ یہ ہے کہ فلاسک کے اندرونی دیوار پر کی گئی پارے کی روپہلی پالش حرارت کو منعکس کرتی ہے اور چونکہ حرارت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے واسطے کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا جب دونوں دیواروں کے درمیان سے ہوا نکال دی جاتی ہے تو درمیان میں خلا رہ جاتا ہے اور حرارت کو باہر جانے کے لئے کوئی واسطہ نہیں ملتا جس کی وجہ سے حرارت فلاسک میں ہی محفوظ رہتی ہے۔

فلاسک کو تھرموس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ سر جیمز ڈیور نے جس شیشہ ساز برجر سے فلاسک کے لئے برتن بنوایا تھا وہ ایک سائنسی آلات بنانے والی کمپنی میں حصہ دار تھا جو برلن میں تھی۔

برجر نے اپنی کمپنی میں ۱۹۰۲ء میں تجارتی بنیادوں پر فلاسک بنانے شروع کر دیئے اور ۱۹۰۴ء میں فلاسک کو اپنی ایجاد کہہ کر پیٹنٹ کروالیا۔ جبکہ فلاسک کا نام رکھنے کے لئے مقابلہ کرایا گیا۔ جس میں "تھرموس" نام منتخب ہو گیا جس کی وجہ سے فلاسک کو تھرموس بھی کہتے ہیں۔

اور یوں برجر نے اپنی تجارتی خود غرضی کی وجہ سے ایک سائنس دان کی زندگی ہی میں اس کی ایجاد اپنے نام کرالی۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے جو تاجروں کے ہاتھوں موجدوں (تخلیق کاروں) کے ساتھ ہوتی آئی ہے۔

ابتدا میں فلاسک پر کوئی حفاظتی تہہ وغیرہ نہیں ہوتی تھی اور اس کا استعمال صرف ہسپتالوں لیبارٹریوں اور نمائشوں ہی تک محدود رہا اور ایک لمبے عرصے تک یہ عام استعمال سے دور رہا۔ لیکن ۱۹۲۵ء میں پہلی بار ایسا فلاسک منظر عام پر آیا جس پر پلاسٹک کو حفاظتی تہہ بھی موجود تھیں۔ جس کی وجہ سے فلاسک عام استعمال میں آگیا اور اب یہ ہر گھر کی ضرورت بن چکا ہے۔

اس کے بعد فلاسک کی نقل کر کے کئی دوسرے آلات بھی بنائے گئے جس میں واٹر کولر بھی شامل ہے۔

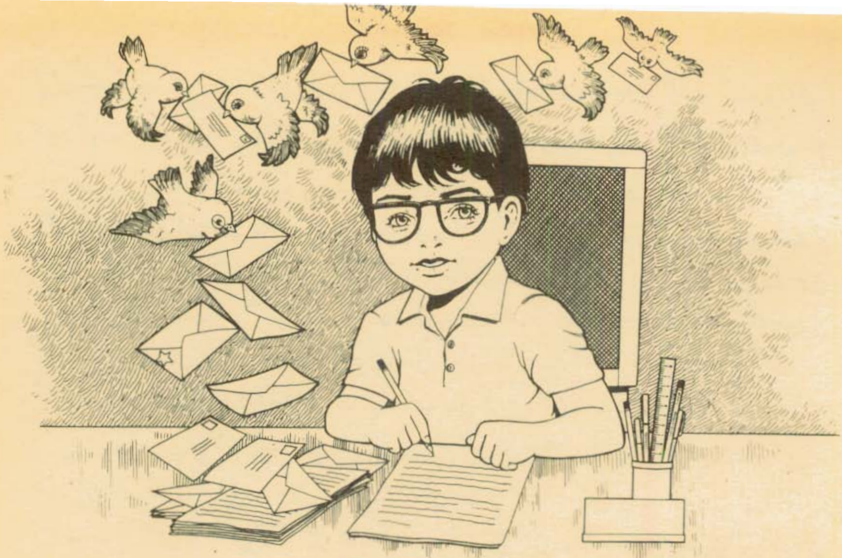

بہ خدمت جناب

محمد ایوب منظر، لاہور۔ اپریل کا حقوقِ اطفال نمبر عید الفطر کے بعد پڑھنے کو ملا۔ بلاشبہ آپ نے اس میں کسی قسم کی کوئی کمی رہنے نہیں دی۔ سَرِورق بچّوں کے حقوق کی محرومیوں کی عکاسی کر رہا تھا۔"وہ دن ضرور آئے گا"،"رہائی"،"روشن چہرے تاریک مستقبل"،"ڈبو"، اور"خرّم مر رہا ہے"نے متاثر کیا۔ **کامران شفیع، کراچی۔** حقوقِ اطفال نمبر پڑھا۔ تمام تحریریں پسند آئیں۔ **برکت علی ہزارہ، سانگھڑ۔** اپریل کے شمارے کی خوبصورتی دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ اس بار آپ نے خوب محنت کی ہے۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ سرورق نہایت دلکش تھا۔ **محمد شہباز گوندل، گجرات۔** اطفال نمبر پڑھ کر پتہ چلا کہ دنیا میں بچّوں کے حقوق کس طرح پامال کئے جا رہے ہیں...... !!!۔ **چوہدری محمد قاسم گورایہ، گوجرانوالہ۔** انکل! میں نے آپ کو حقوقِ اطفال نمبر کے لئے جو کہانی بھیجی تھی، اس کا کیا بنا؟ ○ ......

آپ کی کہانی ناقابلِ اشاعت ہے۔ **عرفان احمد، حیدر آباد۔** اپریل کا آنکھ مچولی بہت پسند آیا۔ لگتا ہے آنکھ مچولی ضرور انعام پائے گا۔ **ارسلان طارق، گوجرانوالہ۔** حقوقِ اطفال نمبر دیر سے ملا لیکن بہت اچھا لگا۔ **ذیشان احمد، کھاریاں چھاؤنی۔** کہانیوں میں"پلمبر"،"زندہ بھوت"،"چوٹ"اور"ہمیں کچھ ہو گیا تھا"قابلِ ذکر تحریریں تھیں۔ لطیفے بھی اچھے تھے۔ "بچاؤ" کی قسط پسند آئی۔ **محمد افضل ساگر مچھوی۔** اتنا اچھا "حقوقِ اطفال نمبر" شائع کرنے پر میری طرف سے بہت بہت مُبارک باد قبول فرمائیں۔ **زہرا محمد یونس، کراچی۔** حقوقِ اطفال نمبر واقعی اثر انگیز تھا۔ کئی تحریریں ایسی تھیں جنہیں پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ **مہرو جاہت حسنین سرگانہ، خانیوال۔**

اپریل کے شمارے میں عمران سہیل بوبی کی دو ننھی تحریریں نقل شدہ تھیں۔ **جاوید اقبال** کنہہوروی، حیدر آباد۔ آنکھ مچولی اس بار بھی بازی لے گیا۔ **کاشف اسماعیل، کراچی۔** آنکھ مچولی باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ اپریل کا شمارہ پڑھا تو دل خوش ہو گیا۔ **مہوش سکندر، راولپنڈی۔** عید کارڈ بھیجنے کا بہت شکریہ! اس بار آنکھ مچولی اپنی مثال آپ تھا۔ تمام مضامین اور کہانیاں پسند آئیں۔ **اعجاز حسین پٹھان، عمر کوٹ۔** اتنے کم وقت میں اتنا خوب صورت رسالہ۔ یقین نہیں آ رہا۔ **صائمہ دلدار، جہمرہ سٹی۔** آنکھ مچولی نے میری تحریریں شائع کیں۔ بہت بہت شکریہ! اطفال نمبر بے حد شاندار رہا۔ خصوصی فیچرز بہت اچھے تھے۔ کہانیاں بھی معیاری تھیں۔ محمد عمر احمد خان کی تحریر "چوٹ" بہت پسند آئی۔ واقعی معذور بچّے خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔ **اعجاز احمد شاہین، سرگودھا۔** کسی کا دل دُکھانا بُری بات ہے۔ آپ میری تحریریں شائع نہ کر کے میرا دل دُکھا رہے ہیں۔ ○

...... پیارے بھائی! آپ کی تحریر اچھی اور معیاری ہوگی تو ضرور چھپے گی۔ ہم کسی بھی ساتھی کا دل دُکھائیں؟ یہ ہر گز نہیں ہو سکتا۔ **زبیر احمد خان، کراچی۔** اطفال نمبر آپ نے واقعی بہت ہی محنت سے شائع کیا ہے۔ کہانیوں میں "ڈبّو"، "چوٹ"، "مستقبل کا مستقبل"، "ہمیں کچھ ہو گیا تھا"، "تم بچے نہیں رہے"، "خرّم مر رہا ہے"، "میں بھی آپ کی بیٹی ہوں" اور "ذرا سی بھول" بے حد پسند آئیں۔ **طٰسین خان، احمد خانوالہ۔** اپریل کا شمارہ پڑھا، بہت پسند آیا۔ **زاہد منان قریشی، چترپڑی (آزاد کشمیر)** اس دفعہ پرچہ دیر سے ملا لیکن پڑھ کر ساری کوفت دور ہو گئی۔ تمام مضامین و کہانیاں اچھی لگیں۔ "زوولوجیکل گارڈن نے بہت متاثر کیا۔ طاہر مسعود صاحب نے اس میں ایک بہت اہم مسئلے کو جس شگفتہ انداز میں بیان کیا وہ قابلِ تعریف ہے۔

محمد عظیم قریشی، اسلام آباد۔ تمام شکایات کے باوجود آنکھ مچولی مجھے پسند ہے کیوں کہ اس کو پڑھے بغیر چین نہیں آتا۔ میری دُعا ہے کہ آپ کا رسالہ اتنی ترقی کرے کہ آسمان کی بُلندیوں کو چھُو لے۔ آمین! **سید قمر علی، لانڈھی ۲، کراچی۔** آنکھ مچولی کی محفل میں پہلی بار شرکت کر رہا ہوں۔ اُمید ہے حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ اگر آپ اجازت دیں تو ایک مضمون ارسال کر دوں؟ ○ ...... بالکل جناب! اجازت ہے!!۔ **سکندر بٹ، سٹلائٹ ٹاؤن ۲ گوجرانوالہ۔** آنکھ مچولی مجھے بے حد پسند ہے۔ اشتیاق احمد کا قسط وار ناول اچھا جا رہا ہے۔

صائمہ فخرالدین، جھڈو، تھرپارکر۔ اپنی انفرادیت کی وجہ سے آنکھ مچولی مجھے پسند ہے۔ پہلی دفعہ شرکت کر رہی ہوں۔ آپ رنگین صفحات زیادہ دیا کریں۔ **فواد خان، (؟)** انکل! اگر آپ نے میرا خط شائع نہ کیا تو پھر میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گا اور آئندہ کوئی خط اور کہانی نہیں لکھوں گا......!! ○ ...... لیجئے! خط شائع کر دیا۔ اب تو ناراض نہیں ہیں نا آپ؟ **صاحبزادی زرتاج شامی، یونیورسٹی روڈ، کراچی۔** آپ نے آنکھ مچولی کا تحفہ بھجوایا۔ بہت شکریہ! میرا خط رسالے میں ضرور شائع کیجئے گا تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے کہ آپ کو میرا خط مل گیا ہے۔ **عافیہ سعید سحر، چکوال۔** میرے میٹرک کے امتحانات ہونے والے ہیں۔ کامیابی کے لئے مجھے آپ کی دُعاؤں کی ضرورت ہے۔ ○ ...... آپ دل لگا کر محنت کیجئے! ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں!!!۔ **نوشابہ نرگس (؟)** جنوری ۹۳ کے شمارے میں بنتِ نائمہ کا خط پڑھا۔ وہ سمجھتی ہیں کہ سارا قصور لڑکوں کا ہے حالانکہ کافی قصور بے پردہ لڑکیوں اور معاشرے کا ہے۔ میری لڑکوں سے بھی یہ التجا ہے کہ وہ اپنی عادتوں کو سنوار لیں اور معاشرے کے اچھے، مہذّب اور

ایک خط ایک مسئلہ

محترم مدیر صاحب
السلام علیکم!

بعد تسلیمات عرض ہے کہ میں نہم جماعت کا طالب علم ہوں۔ آنکھ مچولی کے توسط سے قارئین کی توجہ ایک اہم مسئلہ کی جانب دلانا چاہتا ہوں۔

پرسوں کی بات ہے۔ اسکول گیا تو اسکول کی داہنی جانب واقع ایک بُک اسٹال اور قریبی دُکانوں پر تھوڑی سی تبدیلی نظر آئی۔ کچھ طالب علم اور طالبات وہاں کھڑے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ عید کی آمد آمد ہے اس لئے ان دُکانوں پر عید کارڈز فروخت ہو رہے ہیں۔ تقریباً ہر سال یہ عید کارڈز فروخت ہوتے ہیں۔ یہ عید کارڈز کس قسم کے اور کیسے ہوتے ہیں؟ وہ میں بیان کرنا نہیں چاہتا۔ ظاہر ہے یہ سب جانتے ہیں۔

المیہ یہ ہے کہ یہ عید کارڈز پرائمری اور سیکنڈری کلاسز کے نو عمر طلبا اور طالبات خریدتے ہیں اور اکثر و بیشتر یہ کارڈز ان کی کتابوں میں ملتے ہیں یہ عید کارڈز ان بچّوں پر بڑے بُرے اثرات چھوڑتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ فاشی کی بُنیاد ہیں اور ایک سوچی سمجھی سازش ہے جس کے ذریعے پاکستان کا ایک دشمن، ملک و قوم کو تباہ کرنے کے در پے ہے۔ شروع دن سے ہی ہمارا ملک اس دشمن کی نظر میں کھٹک رہا ہے۔ پہلے اس دشمن نے بذریعہ جنگ ہمیں آزمایا لیکن ناکام رہا۔ اب وہ دشمن..... ایک منظّم طریقے سے اور بڑے پیمانے پر پاکستانی قوم سے نظریاتی سرحدوں پر جنگ لڑ رہا ہے اور اس جنگ میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو چکا ہے......!!

طالب علم معمارانِ وطن ہیں۔ ان ہی کو آگے بڑھ کر ملک و قوم کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔ ہمارا دشمن اسی بنیاد کو اُدھیڑنا چاہتا ہے۔

وہ نئی نسل اور نئی پود کو وی سی آر، ویڈیو گیمز اور فحش عید کارڈوں کے ذریعے تباہ کر رہا ہے۔ کیا ہم اس بات سے بے خبر ہیں؟؟ ہرگز نہیں!!!

میری تمام پاکستانی طالب علموں اور والدین سے گزارش ہے کہ خدارا اس حقیقت کو پہچانیں اور دشمن کے شیطانی ہتھکنڈوں سے بچتے ہوئے اس کی چالوں کو ناکام بنا دیں......!! عابد انور۔ لانڈھی، کراچی۔

۔ ذمّہ دار شہری بننے کی کوشش کریں۔ **غلام مصطفیٰ، مائی قدم روڈ، ٹھٹھہ**۔ پہلی مرتبہ آنکھ مچولی میں خط لکھ رہا ہوں، اُمید ہے حوصلہ افزائی کریں گے۔ **فائزہ امین، مرید کے**۔ پہلی بار آنکھ مچولی خریدا، پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ کیا میں اس میں اپنی کہانیاں بھیج سکتی ہوں؟ کس طرح بھیجوں؟؟ ○ ...... آپ دلچسپ اور مختصر کہانی لکھ کر لفافے میں بند کر کے آنکھ مچولی کے پتے پر بھیج دیجئے!!!۔ **محمد صدّیق بلوچ، سوئی، بلوچستان**۔ پہلی بار محفل میں شرکت کر رہا ہوں۔ میری لِکھائی خراب ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میرا خط شائع نہیں کریں گے!!۔

۔ **محمد ارشاد رمضان، لیاری، کراچی**۔ مجھے ستمبر، اکتوبر اور نومبر ۹۲ء کے رسالے درکار ہیں؟ ○ ...... آپ تیس روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال کر دیجئے۔ رسالے آپ کو بھیج دیئے جائیں گے۔ **کائنات کاظمی، چمبڑ**

(سندھ) مانا کہ آپ کے رسالے کی کارکردگی شاندار بلکہ بہت ہی شاندار ہے لیکن اب اس میں کچھ کمی آگئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو اپنے پڑھنے والوں سے محبت نہیں رہی۔ پہلے آپ ہماری پسند اور ناپسند کا خیال رکھتے تھے جس کی وجہ سے رسالے نے بہت کم وقت میں زیادہ ترقی کی لیکن اب تو لگتا ہے جیسے آپ صرف ایوارڈ حاصل کرنا چاہتے ہیں......!!! ○

......پیارے بھائی! تنقیدی خط ہم بڑے غور سے پڑھتے ہیں کیوں کہ ہم خامیوں کی اصلاح سے بالکل نہیں گھبراتے۔ رہی ایوارڈ حاصل کرنے والی بات تو ایوارڈ کس کے لئے حاصل کرتے ہیں؟؟ آپ لوگوں ہی کے لئے......!!! **محمد حسن، شہزاد گل اعوان، لاہور۔** اس ماہ کا آنکھ مچولی بہت پسند آیا۔ سرورق کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ لطائف بھی بہت اچھے تھے۔ **فائزہ کرن، بہاولپور۔** آنکھ مچولی میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ بھائی جان ہر دفعہ یہی لا کر دیتے ہیں۔ **نازیہ کنول، بھکر۔** کوپن بھر کے بھیج رہی ہوں کیا میں تحفہ حاصل کرنے کی اُمید رکھوں؟ ○......بھئی! اُمید پر تو دنیا قائم ہے۔ **عنبرین گلزار علی، گارڈن ویسٹ، کراچی۔** آنکھ مچولی کے لئے کچھ تحریریں ارسال کرنا چاہتا تھا مگر کیا فائدہ۔ شائع تو ہونے سے رہیں۔ ○......بھائی! اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کریں۔ **نائلہ ایوب، اٹک۔** آنکھ مچولی کی کہانیاں نہایت سبق آموز اور دلچسپ ہوتی ہیں۔ **فیاض احمد انیس، میاں چنوں۔** انکل! جب سے آپ نے میرا تعارف "ساتھی بچپن کے" میں شائع کیا ہے تب سے مجھے بیسوں بیرنگ خطوط موصول ہو چکے ہیں لیکن کوئی بھی عقلمند اس میں اپنا ایڈریس تحریر نہیں کرتا۔ بعض خطوط میں یہ تحریر ہوتا ہے "میں خیریت سے ہوں، خدا کرے کہ آپ بھی خیریت سے ہوں۔" میرا تمام جیب خرچ بیرنگ خطوط کی نذر ہو جاتا ہے۔ پلیز! آپ کچھ کیجئے!!! ○......بھئی! یہ تو واقعی آپ کے ساتھ زیادتی ہے۔ دوستی تو بہت پیارے اور اچھے جذبے کا نام ہے۔ سچے دوست اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایسی حرکتیں نہیں کرتے!!!۔ **محمد عمران ذکریا میمن، سکھر۔** میں چاہتا ہوں کہ اشتیاق احمد آنکھ مچولی کے لئے ہمیشہ لکھتے رہیں۔ **عابدہ مجید، (؟)** مجھے آنکھ مچولی بہت پسند ہے۔ فروری کے شمارے میں "پھر کیا ہوا" مجھے بے حد اچھی لگی۔ **فرحین ابرار، سرگودھا۔** انکل! اگر آپ نے میرا خط شائع نہ کیا تو میرا دل ٹوٹنے کا سارا الزام آپ کے سر ہوگا۔ ○......بھئی! آپ لوگ ہماری مجبوریوں کا بالکل احساس نہیں کرتے۔ دل ٹوٹنے کا سارا الزام ہمارے سر ہی ڈال دیتے ہیں......!!! **نائلہ وانی، سکردو، بلتستان۔** جب تک آپ میرا خط شائع نہیں کریں گے میں خط لکھتی رہوں گی۔ ○......ہماری تو دلی خواہش ہے کہ بچے آنکھ مچولی کو ہمیشہ خطوط لکھتے رہیں۔ جن بچوں کے خط نہیں چھپتے انہیں ہم سے ناراض نہیں ہونا چاہئے کیوں کہ ہم اتنے سے کالم میں سب بچوں کو جواب نہیں دے سکتے لیکن ہم تمام ساتھیوں کے خطوط غور سے پڑھتے ہیں اس طرح تمام ساتھیوں کے دل کی بات ہم تک پہنچ جاتی ہے۔ **عائشہ عزیز، ڈیرہ غازی خان۔** انکل! مجھے خوشامد نہیں آتی جس سے کام لے کر میں رسالے کی تعریف کروں بہرحال آنکھ مچولی کا خاص نمبر بے مثال تھا۔ ہر موضوع پر بڑی گہرائی سے روشنی ڈالی گئی۔ میری طرف سے اتنا اچھا رسالہ شائع کرنے پر مبارک باد۔ **بینارا نبیل، مظفر گڑھ۔** آنکھ مچولی کے صفحات پہلے زیادہ ہوتے تھے اب روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلے ہر قاری کو اس کے ساتھ تحفے مل جاتے تھے اب غائب ہوتے ہیں۔ اس کی تازہ مثال مارچ ۹۳ء کا شمارہ ہے جس کے ساتھ اخبار فدان کا تحفہ ہمیں نہیں مل سکا۔ بخدمت جناب میں خط بھی اوٹ پٹانگ شامل کئے جاتے ہیں۔ ایک خط ایک مسئلہ کو میرے خیال میں کہانی یا مضمون کی صورت میں چھاپا جائے تو بہتر رہے گا۔ اس رسالے کا ایک سلسلہ "دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟" اکثر غائب ہوتا ہے۔ اس سلسلے کو اگر مستقل شامل رکھا جائے تو بچے دنیا میں پیش ہونے والے واقعات و حالات سے آگاہ رہیں گے۔ ○......آپ کا خط چھاپ رہے ہیں۔ تنقید کا بے حد شکریہ! آپ کی شکایات نوٹ کر لی گئی ہیں۔

چھوٹی سی بات

شگفتہ شمیم

"لو جی ...... مرے پر سو دُرّے ...... اس گھر میں شرارتی بچوں کا ٹولہ کم تھا جو یہ بی بی ایک نئی مصیبت لے آئیں۔" پھوپھی اماں کی سماعت کو جھنجھوڑتی ہوئی تیز آواز پر میں "انسانی دل اور اس کے نظام" کے سوال و جواب کا رٹّا لگاتے ہوئے چونک پڑی۔ "ضرور مانو بلّی نے کوئی نیا کارنامہ انجام دیا ہے۔" میں فوراً صحن کی طرف بھاگی مگر وہاں کا منظر دیکھ کر ایک لمحے کو ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔

پھوپھی اماں لکڑی کی چوکی پر سر پکڑے بیٹھیں سبزیوں کے تھال کو گھور رہی تھیں جو سبزیوں سمیت فرش پر الٹا پڑا تھا اور ان کارروائیوں کی ذمہ دار مانو چوکی کے پائے پر پنجہ آزمائی میں مصروف تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے "کھسیانی بلّی کھمبا نوچے" والا محاورہ یاد آگیا۔ مگر مانو بلّی کھسیانے والی شے کہاں تھی وہ تو ایسا اس وقت کرتی تھی جب بہت زیادہ شرارت کے موڈ میں ہو۔

"لگتا ہے آج پھر تمہارا دماغ خراب ہوا ہے ٹھہرو ابھی بتاتی ہوں تمہیں۔" میں نے مصنوعی غصّہ دکھاتے ہوئے مانو کو ایک چپت رسید کی تو وہ

دونوں ہاتھوں کے درمیان چہرہ چھپا کر فرش پر لیٹ گئی۔ "دیکھا کتنی چالاک ہے یہ۔ مار سے بچنے کے لئے کیسا طریقہ نکالا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ائے ہٹو بھی ...... مجھے معلوم ہے تم بھی کم نہیں ہو۔ پہلے مجھے یہ چیزیں اٹھا کر دو پھر اپنی بلّی کے لاڈ کرنا۔" پھوپھی اماں غصے سے بولیں مگر ان کی مسکراہٹ بتارہی تھی کہ وہ بھی مانو کی اس ادا سے لطف اندوز ہوئی ہیں۔

مانو بلّی پہلے کبھی اتنی شرارتی نہیں تھی۔ وہ تو بہت معصوم اور سیدھی سادی سی ہوا کرتی تھی۔ مجھے گھر میں مانو بلّی کی آمد کا واقعہ یاد ہے۔ اس دن ابّا جی کی پہلی برسی تھی۔ میں لاؤنج میں بچھی چاندنی پر سب لوگوں کے ساتھ بیٹھی سپارہ پڑھ رہی تھی کہ ایک ننھا منا بلّی کا بچّہ چھوٹے چھوٹے ...... قدم اٹھاتا ہوا میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"یہ میں تمہارے لئے لائی ہوں۔" مجھے اپنی دوست مہوش کی سرگوشی سنائی دی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ بھورے رنگ کا بہت پیارا مگر بہت کمزور اور دبلا پتلا سا بلّی کا بچّہ تھا۔

"یہ تمہیں کہاں سے ملا؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"گوشت والے کی دکان سے۔ بے چارہ اکیلا تھا۔ شاید اس کے ماں باپ نہیں ہیں۔"

"چچ چچ بے چارہ!"

"تم پالو گی؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ...... اور آج سے اس کا نام مانو ہے۔" میں بے تحاشا خوش ہوئی۔

گھر میں مانو بلّی کی آمد پر سب لوگ بہت خوش تھے۔ سوائے چند لوگوں کے جن کا خیال تھا کہ بلّیاں دمے جیسی موذی بیماری کا باعث ہوتی ہیں۔ پھر بھی مانو کو چند شرائط پر گھر میں رہنے کی اجازت مل گی۔ وہ شرائط یہ تھیں کہ مانو بلّی باورچی خانے کے دروازے کے قریب بھی نہیں پھٹکے گی۔ چھوٹے بچّوں کے نزدیک اسے جانے سے روکا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

مانو بہت جلد ہم لوگوں سے مانوس ہوگئی۔ اس کی صحت بھی اچھی ہوتی گئی۔ سارا دن کھیل کود میں مصروف رہتی۔ صحن میں چڑیوں کے پیچھے بھاگنا اور گھاس پر لوٹنیاں لگانا، مانو کا محبوب مشغلہ تھا۔ جب بچّے بھاگ دوڑ کا کھیل کھیل رہے ہوں تو مانو بھی ان کے ساتھ بھاگتی رہتی۔ کرکٹ کا میچ ہوتا تو مانو دوسرے بچّوں کے پہنچنے سے پہلے ہی دوڑ کر گیند پکڑ لیتی اور بچّے پڑوس کے بچّوں پر رعب جماتے کہ "دیکھا ہمارے پاس کتنا اچّھا فیلڈر ہے۔"

وہ جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی ویسے ویسے اس کی شرارتوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ شرارت جب تک تمیز کے دائرے میں رہے قابل قبول ہوتی ہے مگر جب یہ دائرہ پار کر جائے تو بدتمیزی بن جاتی ہے۔ مانو بلّی کے ساتھ یہ مشکل تھی کہ وہ

جانور تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کی کون سی شرارت بدتمیزی میں شمار ہوتی ہے اور کون سی صرف ہلکی پھلکی شرارت ہوتی ہے۔ مگر اس کے باوجود مانو بہت ذہین تھی۔ وہ سب کے چہروں سے اندازہ لگا لیتی تھی کہ اس نے اچھا کام کیا ہے یا بُرا۔

مانو بلی ہر ہلتی جلتی چیز کی دشمن تھی۔ زمین پر کوئی کیڑا چل رہا ہو.... تو مانو بھاگ کر اسے دبوچ لیتی اور اس وقت تک نہیں چھوڑتی جب تک وہ بے چارہ اس دارِ فانی سے کوچ نہ کر جائے۔ کبھی کبھی مانو کی یہ حرکت نقصان کا باعث بھی ہوتی تھی۔ خاص طور پر جب کوئی جھاڑو لگا رہا ہو۔ ادھر اس نے جھاڑو دینا شروع کیا ادھر مانو صاحبہ اسے دبوچنے کو تیار ہو جاتیں۔ لاکھ سمجھایا کہ یہ جھاڑو کا سرا ہے، تمہارے من پسند چوہے کی دم نہیں مگر مانو بھلا کب سمجھنے والی تھی ایک دفعہ تو اس نے حد ہی کر دی۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ بھائی جان فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ انہوں نے اخبار کو پورا کھول رکھا تھا اور بڑے انہماک سے کوئی خبر پڑھ رہے تھے۔ پنکھے کی ہوا سے اخبار کا ایک کونہ ہلکے ہلکے ہل رہا تھا کہ مانو کی نظر اس پر پڑ گئی۔ "ضرور کوئی جانور بھائی جان کو نقصان پہنچانے جا رہا ہے۔" مانو حسب معمول اسے پکڑنے کو تیار ہو گئی۔ پہلے تو اس نے ایک منٹ تک پہلو بدل بدل کر اس کا نشانہ لیا پھر جو ایک فٹ دور سے چھلانگ لگائی تو سیدھا بھائی جان کی گود میں۔ بھائی جان اس ناگہانی آفت پر بوکھلا کر اچھل پڑے۔ انجانے خوف سے ان کے حلق سے ایک چیخ بھی نکل گئی جسے سن کر سب لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب بھائی جان کی سمجھ میں معاملہ آیا تو وہ چپل اٹھا کر اسے مارنے کو دوڑے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ مانو فوراً باہر کی جانب بھاگی ورنہ اس دن بھائی جان کے ہاتھوں مانو کی خیریت نہیں تھی۔

ایک دن مجھے مانو کچھ میلی میلی سے لگی۔ مجھے یاد آیا کہ وہ تو کبھی نہائی ہی نہیں۔ یہ کتنی خراب بات تھی۔ آج تو مانو کو ضرور نہلانا چاہئے۔ میں مانو کو صحن میں لگے نل کے نیچے بیٹھا کر نہلانے لگی۔ ابھی اس پر پانی کی چند بوندیں ہی پڑیں تھیں کہ وہ زور سے اچھلی۔ ایک ہی جست میں یہ جا وہ جا۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ مانو گندے بچّوں کی طرح نہانے سے گھبراتی ہے۔ بہت ڈھونڈنے پر وہ چنبیلی کے پودے کے پیچھے چھپی ہوئی نظر آ گئی۔

"آجاؤ مانو ...... دیکھو میں تمارے لئے کتنا خوشبو دار صابن لائی ہوں۔" میں نے اسے چُمکارا۔ "دیکھو جب تم نہالو گی نا تو تمہارے بال سونے کی طرح چمکنے لگیں گے۔" میں مانو کی خوشامد کرتے کرتے تھک گئی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ آخر کار میں نے اسے زبردستی پکڑا اور اسے صابن سے رگڑ رگڑ کر نہلانے لگی۔ مانو بہت

تڑپی مچلی مگر بے سود۔ بعد میں جب میں نے پھوپھی اماں کو اپنے ہاتھ پہ لگنے والے مانو کے پنجوں کے نشان دکھائے تو وہ الٹا مجھے پر برس پڑیں۔

"ائے باولی ہوئی ہو کیا؟" وہ غصے سے بولیں۔ "بلّیوں کو نہلانے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ ان کا اپنا الگ ہی نظام ہوتا ہے۔ دیکھا نہیں کیسے سارا دن بیٹھی اپنے جسم کو چاٹتی رہتی ہے۔ اس..... کے جسم کی صفائی اسی طرح ہوتی ہے۔" انہوں نے مجھے سمجھایا۔

اس روز مانو سارا دن مجھ سے روٹھی رہی۔ آخر بہت سوری کرنے اور گرم گرم دودھ پلانے کی شرط پر مانو نے اپنے ناراضگی ختم کی۔

ایک روز ہم لوگوں کا سمندر کے کنارے پکنک کا پروگرام بن گیا۔ بھائی جان نے مانو کے گم ہوجانے کے ڈر سے اسے لے جانے سے منع کرایا تھا۔ ہم لوگ مانو کو چھوڑ کر چل پڑے اور وہ بے چاری خاموشی سے گیٹ کے نیچے سے ہمیں جاتا دیکھتی رہی۔

پکنک سے واپسی پر رات ہو گئی تھی۔ میں جب اندر داخل ہوئی تو دیکھا کہ مانو ایک کونے میں دیوار کے ساتھ لگی بیٹھی تھی اور اس کے کھانے کا برتن خالی پڑا تھا۔

"آئی ایم سوری مانو ...... تمہیں آج ہماری وجہ سے بھوکا رہنا پڑا۔" میں نے اسے چمکارتے ہوئے اس کے خالی برتن میں دودھ ڈالا مگر مانو نے دودھ کو منہ نہیں لگایا اور نہ ہی میرے پاس آئی۔

دوسرے دن مانو بیمار پڑ گئی۔ بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے باہر نہ جانے کیا کھا پی لیا تھا کہ اسے بدہضمی ہو گئی۔ قریب میں کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔ بس گھریلو طریقوں سے اس کا علاج کیا جاتا رہا مگر مانو ٹھیک نہیں ہوئی۔ اس نے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا۔ ہر وقت اپنے بستر پر آنکھیں موندے پڑی رہتی۔

وہ بہت اُداس رات تھی۔ ہم سب خاموشی سے بیٹھے پڑھ رہے تھے کہ مانو کے گھنگرو کے چھن چھن کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اپنے بستر سے نیچے اتر رہی تھی۔

"شاید مانو ٹھیک ہو رہی ہے۔" ہم نے خوش ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ مانو آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"مانو! میری پیاری مانو۔" میں نے بے اختیار ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھانا چاہا مگر مانو بے حس پڑی رہی۔ ہم سب رونے لگے۔

"مانو میری اچھی مانو ...... روٹھو نہیں دیکھو ہم آئندہ کبھی تمہیں چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔" میں نے مانو کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ مگر مانو میری بات کہاں سن رہی تھی۔ وہ انسانوں کی پیاری سی دوست، ان کے کھیل کود کی ساتھی، انسانوں کی بے رخی برداشت نہیں کر سکی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روٹھ گئی۔

پھلوں اور ترکاریوں میں فرق

نگہت آرا چوہان

پھل عام طور پر پودے کے اس گودے دار حصے کو کہتے ہیں جو پھولوں سے پیدا ہوتا ہے اور اس میں بیج ہوتے ہیں۔ سبزیاں جڑی بوٹیوں کی نسل کے پودے ہوتے ہیں۔ جڑی بوٹی وہ پودا ہوتا ہے جس کا تنا نرم ہوتا ہے اور اس میں لکڑی کے ریشے بہت کم یا بالکل نہیں ہوتے۔

ماہرینِ نباتیات کے نزدیک پودے کا وہ حصّہ جس میں بیج ہوتے ہیں، پھل ہوتا ہے۔ وہ پھلوں کی تین خاص درجوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک تو گودے دار پھل جن کے گودے میں بیج ہوتے ہیں جیسے کہ سنگترے، تربوز، خربوزے، بیر اور سیب۔ دوسرے وہ پھل جن میں گڑھے یا گٹھلی ہوتی ہے مثلاً چیری، آلو بخارا، آڑو اور خشک پھل جیسے کہ اخروٹ، غلے، پھلیاں اور مٹر۔ اگر آپ کو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ ماہرینِ نباتیات پھلیوں اور مٹر کو پھل خیال کرتے ہیں کیونکہ ان میں بیج ہوتے ہیں تو آپ کو یہ جان کر اور بھی حیرت ہوگی کہ کھیرے، ککڑیاں اور بڑا مٹر بھی پھل کہلائے جاسکتے ہیں۔ اس بات کا انحصار اس پر ہے کہ ہم کس حد تک فنّی اصطلاحات استعمال کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ دنیا کے مختلف حصّوں میں کھانے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں اس لئے کسی پودے کا کھایا جانے والا حصّہ اگر ایک ملک میں سبزی کہلاتا ہے تو دوسرے میں پھل۔

جس طرح دنیائے حیوانات میں مشترکہ خصوصیات والے جانوروں کے خاندان ہوتے ہیں اسی طرح بہت سی ترکاریوں کا ایک دوسرے سے تعلق ہوتا ہے مثلاً کیا آپ جانتے ہیں کہ بند گوبھی، شلجم، مولی، گانٹھ گوبھی اور پھول گوبھی ایک ہی

چوک ترکاریوں کے ایک دوسرے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

پیٹھے کے خاندان میں کھیرے، ککڑی، خربوزے، تربوز اور کدو لوکی وغیرہ شامل ہیں۔ مٹر کے خاندان میں مٹر، ہر قسم کی پھلیاں، مونگ پھلی اور سویا بین شامل ہیں۔ ماز چوبہ خاندان میں، پیاز، جنگلی پیاز، گندنا اور عقاان ہیں۔ چقندر، پالک اور سوئس کارڈ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ترکاریوں کا ایک خاندان Night Shade "رات کا سایہ" کہلاتا ہے اس میں ٹماٹر، بینگن، کالی مرچ اور تمباکو شامل ہیں۔ پھل اور سبزیاں اس لئے ایک جیسی ہوتی ہیں کیونکہ وہ ہمیں صحت مند رکھنے کے لئے وٹامن (حیاتین) اور دھاتیں فراہم کرتی ہیں۔

پُراسرار واقعات

محمد انعام فاروقی

(۱) معتصم باللہ عباسی خاندان کا آٹھواں خلیفہ تھا ...... وہ اپنے بھائیوں میں بھی آٹھواں تھا۔ اس کے آٹھ بیٹے اور آٹھ بیٹیاں تھیں۔ اس نے آٹھ ہزار غلام چھوڑے اور آٹھ جنگیں جیتیں۔ اس نے آٹھ سال، آٹھ ماہ اور آٹھ دن حکومت کی۔ وہ ۲۲۷ھ میں ربیع الاول کا مہینہ ختم ہونے سے آٹھ دن پہلے وفات پا گیا تھا۔

□ ...... □ ...... □

(۲) جین سوم جو سترہویں صدی عیسوی میں بادشاہ بنا، سترہ جون کو ہی پیدا ہوا تھا۔ جون سترہ تاریخ کو ہی وہ تخت پر بیٹھا تھا۔ جون سترہ تاریخ کو ہی اس نے شادی کی تھی۔ اور سترہ جون کو ہی اس نے

وفات بھی پائی تھی۔

□ ...... □ ...... □

(۳) شہزادہ بسمارک کو بھی تین کے ہندسے سے عجیب و غریب رغبت تھی۔ اس نے تین اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ تین ملکوں میں سفیر متعین رہا۔ تین بادشاہوں کے زیرِ اثر رہا۔ تین جنگوں میں حصہ لیا۔ امن کے تین معاہدوں پر دستخط کیئے۔ اس کے تین نام تھے۔ اس کو تین خطاب ملے۔ اس نے تین بار استعفیٰ دیا۔ اس کے تین بچّے تھے اور اس پر تین بار قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔

□ ...... □ ...... □

(۴) چارلس پنجم جرمنی کا بادشاہ تھا۔ اس نے ۱۳۱۶ سے ۱۳۷۶ تک حکومت کی۔ وہ روزانہ ۴ مرتبہ کھانا کھایا کرتا تھا۔ اس کے ۴ محل تھے۔ ہر محل میں چار کمرے تھے۔ ہر کمرے میں چار دروازے اور چار میزیں تھیں۔ اس کے شاہی تاج میں صرف چار ہیرے جڑے ہوئے تھے۔

□ ...... □ ...... □

(۵) جنوبی فرانس کے پہاڑی علاقوں میں ایک قدرتی چشمہ ہے۔ جو ایک سرنگ نما غار کے اندر ہے۔ اس چشمے کا پانی گھڑی کی مانند وقت کی پابندی کے ساتھ ۳۶ منٹ اور ۳۶ سیکنڈ بہتا رہتا ہے اور ۳۲ منٹ اور ۳۲ سیکنڈ کے لئے رک جاتا ہے۔ اتنے وقفے کے بعد وہ پھر اتنی ہی دیر مسلسل بہتا رہتا ہے۔

(۶) آسٹریلیا کے شہر ایڈلیڈ میں ایک عورت نے ایک بچے کو جنم دیا۔ جو حسن اتفاق کی بہترین مثال قرار دیا گیا۔ بچّہ ۱۹۷۷ء کے ساتویں مہینے کی سات تاریخ کو صبح ٹھیک سات بج کر سات منٹ پر پیدا ہوا۔ اس کا وزن بھی سات پونڈ اور سات اونس ہے۔ اسے دنیا کا خوش قسمت بچّہ قرار دیا گیا ہے۔

□ ...... □ ...... □

(۷) جرمنی کی مشہور جنگ "جنگ پیزک" ۱۸ اکتوبر ۱۸۷۳ء کو ہوئی۔ اس جنگ کی یاد میں ایسا ہال تعمیر کیا گیا ہے جس میں تمام چیزوں کی تعداد اٹھارہ ہے۔ مثلاً اس ہال میں ۱۸ جالیاں، ۱۸ فانوس، ۱۸ ہی مجسّمے ہیں۔ اس جنگ میں ۱۸ فوجی جرنیلوں کی حکمت عملی سے فتح حاصل ہوئی تھی۔ اور دشمن کے ۱۸ اہم مقامات پر قبضہ کیا گیا تھا۔ جو ہال تعمیر کیا گیا ہے اس میں ان ۱۸ اہم مقامات کے نام بھی ایک بورڈ پر کندہ ہیں۔

(۸) مسٹر جان چرچل روس کے ایک ادیب گزرے ہیں۔ کہتے ہیں کے انہوں نے تین شادیاں کیں۔ ان کے تین بچّے تھے۔ انہوں نے تین چوٹیاں سر کیں۔ وہ تین مرتبہ لڑے۔ وہ تین اخباروں کے ایڈیٹر تھے۔ وہ تین ملکوں میں سفیر رہے ان کے تین نام تھے اور وہ تین تاریخ کو ہی فوت ہوئے تھے۔

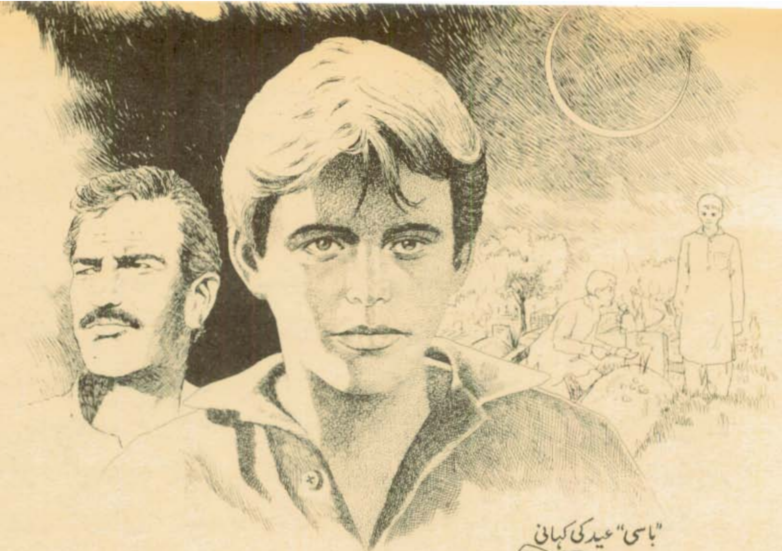

"باسی" عید کی کہانی

دھند

شازیہ فرحین

بیسواں پچیسواں اور آج انتیسواں روزہ تھا مگر زبیر نے اب تک سب سے بات چیت بند کر رکھی تھی، بات کوئی اتنی بڑی نہیں تھی جس کا اس نے اتنا بتنگڑ بنا لیا تھا۔ اکثر ہی ابّا جان ان سب کی بُری حرکتوں پر انہیں ٹوکتے تھے خواہ وہ زبیر ہو یا عمیر، ناز ہو یا گڑیا۔

بس اس روز انہوں نے زبیر کو اس کے دوستوں کے سامنے زبردست قسم کی جھاڑ پلا دی تھی کیونکہ ان کے خیال میں جن لڑکوں کے ساتھ وہ آج کل راہ و رسم بڑھا رہا تھا، ان کا شمار اچھّے لڑکوں میں نہیں ہوتا تھا۔ بس اس واقعے کا بڑا مان کر اس نے اپنی ناراضگی ابّا جان پر ظاہر کر دی تھی۔

کچھ دنوں تک تو سب ہی نے اسے نظر انداز کیا کہ شاید سُدھر جائے، مگر جب اس نے ڈھیٹ پن کا بھرپور مظاہرہ کیا تو ابا جان نے بھی اس سے لاتعلقی اختیار کر لی۔ گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ بھی اس کا رویّہ نہایت سرد تھا۔ کسی چلتے پھرتے روبوٹ کی مانند، وہ افطار اور سحری کرتا اور پھر اپنے اسٹڈی روم میں مقید ہو جاتا۔

اس وقت وہ افطار کے بعد چہل قدمی کے لئے شاید باہر جا رہا تھا کہ عمیر بھیّا نے اسے ٹوکا

"ایسے روزوں کا کوئی فائدہ نہیں۔" انہوں نے نصیحت کرنے کے انداز میں کہا۔ جواب میں اس نے سُنی اَن سُنی کر دی۔

"میں نے کچھ کہا ہے تم سے!" عمیر بھیّا بلند آواز میں بولے۔ اور وہ نہایت بدتمیزی سے پیر پٹختا ہوا چل دیا۔

"گھر کے گھٹن زدہ ماحول سے بہتر تو یہ تنگ گلی ہے۔" اس نے پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے سوچا اور بلاوجہ ہی کولتار کی سڑک پر اپنی سائیکل دوڑا دی۔

سائیکل کے پیڈلوں کو وہ اپنی پوری قوت سے چلاتا رہا، تاکہ کچھ دیر پہلے کا غصہ اس صورت میں چھٹ جائے۔ بہت سا وقت یوں ہی گزر گیا۔

وہ کہیں جانا چاہتا تھا۔ سکون کی تلاش میں، مگر ایسی جگہ تو کوئی نہ تھی جہاں وہ بیٹھ کر اپنے ذہن پر اٹی ہوئی ڈھیروں تھکن زائل کر لے۔ وہ دوست جن کے ساتھ بیٹھ کر وہ ویڈیو گیم، کارڈ اور بہت سے کھیل کھیلا کرتا تھا، وہ بھی اب اس سے بات کرتے ہوئے کتراتے تھے، کیونکہ ابا جان کی ڈانٹ ہی کچھ اس نوعیت کی تھی کہ آئندہ وہ اس کی شکل بھی دیکھ لیتے تو بڑی بات تھی۔

وہ بوریت اور تنہائی کے ملے جلے احساسات کا شکار تھا اور پھر بیساختگی اور عجلت میں وہ بغیر کچھ سوچے ہوئے ویڈیو شاپ میں داخل ہو گیا۔ یہاں ان لڑکوں کا گروپ بھی موجود تھا، جو کھیل میں اس حد تک مگن تھے کہ انہیں اس کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہوا۔ پھر ان لڑکوں نے اسے دیکھا لیکن نظر انداز کر دیا۔ وہ سب اس روز کے واقعے کی وجہ سے ناراض تھے۔

"لڑائی کو جلد ہی ختم کر دینا اچھی بات ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بڑبڑایا مگر جواب میں اب تک وہ سب خاموش تھے۔

"چلو یار کوک اور برگر ہی ہو جائے، آج جیب گرم ہے۔"

آخری ہتھیار استعمال کرتے ہوئے اس نے انہیں گھسیٹا اور اگلے ہی لمحے وہ سب اس کے ساتھ چلتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔

"یار تیرے ابا ہیں بڑے خطرناک۔" یاسر نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں یار بوڑھے ہوگئے ہیں نا!" اس نے بیزاری سے کہا تو سب نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور پھر وہ کوک کی بوتل کے لمبے لمبے گھونٹ بھرنے لگے۔

"یار آج ہو جائے موٹر سائیکلوں کی ریس۔" ضیا نے مختلف باتوں کے دوران تجویز پیش کی جسے سب نے ہی سراہا۔

"ہاں چاند رات کو تو اس کا لطف ہی کچھ اور ہے"، زبیر نے گویا مکھن لگانا ضروری سمجھا۔ ابھی چہ میگوئیاں جاری ہی تھیں، کوئی قہقہے لگا رہا تھا تو کوئی بے ہنگم آوازیں نکال رہا تھا کہ یکایک سامنے کا منظر دیکھ کر زبیر کا سانس سینے میں ہی اٹک گیا، ہاتھ میں تھامی ہوئی کوک کی بوتل جھولنے لگی، سامنے ابا جان اور عمیر بھیا کھڑے، شاید اس کی ہی تلاش میں سرگرداں تھے، اس نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی، رات کا ایک بج رہا تھا، اس کے دوستوں نے اس کے ابا جان کو دیکھ کر دھیما سا نعرہ لگایا اور منٹوں میں ادھر ادھر ہو گئے۔

واقعی وہ ڈینجرس مین تو تھے، ڈرانا، دھمکانا،

رعب و دبدبہ گویا ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ آنے والا لمحہ واقعی گرج برس کا تھا۔ ابا جان کی آنکھوں میں اس کے لئے سخت ناپسندیدگی تھی۔ عمیر بھیا بھی اسے خفگی سے گھور رہے تھے۔

"زبیر تم نے ہمیں بہت مایوس کیا ہے!" وہ دُکھی لہجے میں بولے کیونکہ ان کے خیال میں ڈانٹ ڈپٹ اب اس کے لئے بیکار ہو چکی تھی۔

وہ مجرم بنا کھڑا تھا۔ بہت کچھ سننے کے انتظار میں لیکن کافی لمحے بیت گئے، وہ منتظر ہی رہا کہ کوئی کچھ بولے، مگر شاید وہ سب مایوسی سے مغلوب تھے۔ اسی لئے خاموشی کا گہرا سکوت قائم رہا اور وہ ان دونوں کے پیچھے خاموشی سے قدم بڑھاتا ہوا گھر کی جانب چل دیا۔

گھر میں قدم رکھتے ہی ننھی ناز نے اس کی آمد کا اعلان کیا تو امی اور آپا باہر آئیں ناراضگی سے اسے دیکھا اور اگلے لمحے کسی کے کچھ پوچھنے سے قبل ہی وہ کمرے میں گھس گیا۔

گھر میں چاند رات کی تیاریوں کے ساتھ ہی اس کے بارے میں بھی چہ میگوئیاں ہو رہیں تھیں۔ عمیر بھیا ابا جان کا غصہ ٹھنڈا کر رہے تھے۔ امی جان پریشانی کے عالم میں سورۃ یٰسین کھولے بیٹھی تھیں جب کہ آپا اس کے نئے کپڑوں پر استری کرنے میں مصروف تھیں۔

استری سے فراغت کے بعد انہوں نے عمیر بھیا سے نہ جانے کیا کہا کہ اگلے ہی لمحے عمیر بھیا اس کے کمرے میں تھے۔

"زبیر صبح یہ کپڑے پہن کر عید کی نماز ہمارے ساتھ پڑھنے جانا ہے۔"

حکمیہ انداز میں اس سے کہا گیا لیکن ان کا لہجہ نرم تھا۔ شاید وہ اس مفروضے پر عمل کر رہے تھے کہ محبت سے سمجھائی گئی بات مار پیٹ سے بہتر ہے۔

صبح ہوئی تو گھر میں عید کا ہنگامہ برپا تھا۔ اس نے اوپر سے جھانکا، ابا جان اپنی کالی شیروانی پہنے پہلے سے زیادہ بارعب لگ رہے تھے، یہ شیروانی وہ صرف عید بقر عید پر ہی پہنتے تھے۔ عمیر بھیا بھی شلوار قمیص اور سلیم شاہی جوتیوں میں بہار دکھا رہے تھے۔ آپا اور امی شیر خرمے کی تیاری میں مصروف تھیں۔

ساتھ ہی سب کی نظریں اوپر کی جانب بھی تھیں کہ زبیر آئے تو نماز کے لئے عید گاہ جائیں "نہیں آتا تو نہ سہی" ابا جان نے گولڈن رسٹ واچ میں وقت دیکھتے ہوئے غصہ میں کہا اور آخری بار سیڑھیوں کی جانب دیکھا۔ اس کے آنے کے کوئی آثار نہیں تھے اور پھر وہ فیصلہ کن انداز میں قدم بڑھاتے ہوئے باہر نکل گئے۔ عمیر بھیا بھی سر جھکائے پیچھے پیچھے نکل گئے۔

کچھ دیر بعد جب زبیر کو اطمینان ہو گیا کہ ابا جان جا چکے ہیں تو وہ نیچے آیا اور میز پر سے ٹوپی اٹھا کر باہر جا ہی رہا تھا کہ آپا نے اسے آواز دی۔

"زبیر، ابا جان اور عمیر بھیا ابھی ابھی عید گاہ کی طرف گئے ہیں تم فوراً دوڑ [illegible] !"

انہوں نے عجلت میں کہا۔

"مگر میں اس جگہ نماز کیوں پڑھوں جہاں ابا جان گئے ہوں، عید کی نماز کے لئے اور بھی مسجدیں ہیں۔" ڈھٹائی، اکڑ، ضد، نہ جانے کیا کچھ اس کے لہجے میں تھا۔ آپا اس کا جواب سن کر دنگ رہ گئیں۔

وہ جا چکا تھا اور آپا افسوس کی گہری دھند میں گم تھیں۔ اس نے محلے کی ہی مسجد میں عید کی نماز ادا کی اور قبرستان کی طرف چل نکلا تاکہ ہمیشہ کی طرح دادا جان کی قبر پر فاتحہ پڑھ لے۔

قبر کے سرہانے بیٹھ کر وہ فاتحہ پڑھنے لگا کہ کسی کی دبی دبی سسکیوں کی آواز نے اسے چونکا دیا، اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر ایک طرف اسے وہ دلدوز منظر نظر آ ہی گیا، اس کا ہم عمر لڑکا ایک کچی قبر کے سرہانے بیٹھا بلک بلک کر رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا:

"ابا آپ کیوں چلے گئے مجھے تنہا کیوں چھوڑ دیا، میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا، پیارے ابا آپ مجھے بہت یاد آتے ہیں۔"

پھر لڑکا جیسے اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا:

"ابا اس دفعہ میں اکیلے عید گاہ گیا۔ میں راستے بھر روتا رہا۔ آپ بہت یاد آئے اب ہر عید پر میں روؤں گا ابا۔

کیا آپ میرے خواب میں بھی نہیں آئیں گے۔ میرے اچھے ابا۔"

وہ لڑکا اب قبر سے لپٹ گیا تھا اور آنسوؤں کی گہری دھند اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔ زبیر سے یہ دلدوز منظر دیکھا نہ گیا پچھتاوا اور ملامت کے کتنے ہی سائے اس کی نظروں کے سامنے لہرا گئے اور اس نے لڑکے کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"صبر کرو دوست۔" زبیر نے اسے چپ کرانا چاہا۔ "کیا تمہارے ابا بھی!!" وہ لڑکا دھیرے سے بولا "نہیں نہیں" زبیر نے بیساختہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور جیسے خود بخود اس کے قدم گھر کی طرف اٹھنے لگے۔

گھر پہنچ کر اس نے خلاف توقع سب کو سلام کیا تو سب ہی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ابا جان کہاں ہیں؟" سب کو حیران چھوڑ کر ابھی وہ پوچھ ہی رہا تھا کہ سیاہ شیروانی میں ملبوس ابا جان پر اس کی نظریں جا ٹھہریں۔

اور پھر بغیر کچھ سوچے ہوئے وہ تیزی سے ابا جان کے قریب گیا اور ان کے سینے سے چمٹ گیا۔

"عید مبارک ابا جان۔" رندھی ہوئی آواز میں وہ بولا تو ابا جان نے اس کی پشت پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھ دیا۔

اس لمحے سب نے دیکھا کہ ابا جان کے لب مسکرا رہے تھے جبکہ زبیر کے ڈھیر سارے آنسو ابا جان کی سیاہ شیروانی کو بھگوئے جا رہے تھے۔

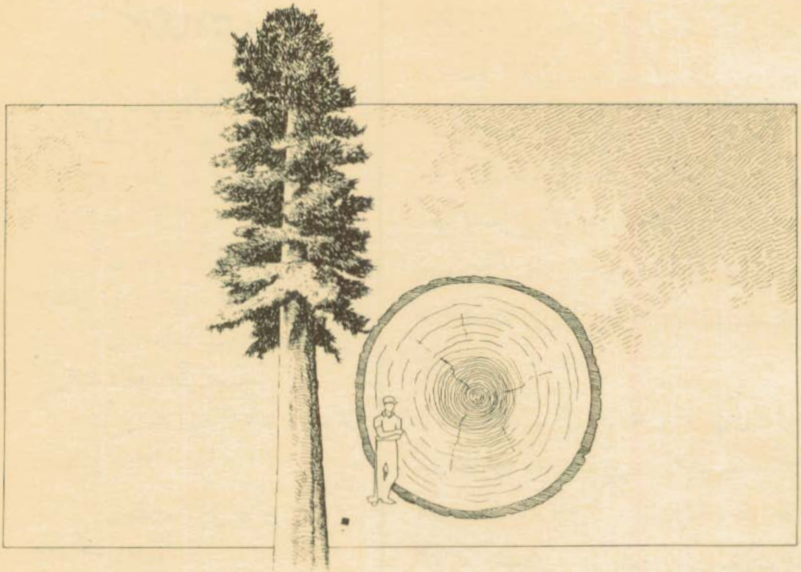

دنیا کا بلند ترین درخت

نگہت

درخت سبز پودے ہوتے ہیں۔ دوسرے پودوں کی طرح ان کی جڑیں، تنے، پتّیاں اور بیج ہوتے ہیں۔ تمام سبز پودوں میں درخت سب سے زیادہ قدیم ہیں۔ شمالی امریکہ کے شمال مغرب میں بعض صنوبر سے ملتے جلتے ہیں "سیکوا" درخت چار ہزار سال سے بھی زیادہ پرانے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا تو یہ درخت کافی بوڑھے ہو چکے تھے۔

درخت تمام سبز پودوں میں سب سے زیادہ بڑے ہوتے ہیں۔ بلند ترین درخت جن کا دنیا میں اب تک پتہ چلا ہے .... کیلفورنیا کے دیو قامت "ریڈووڈ" ہیں۔ اس قسم کا ایک درخت "ہمبولٹ نیشنل فارسٹ" میں دنیا کا بلند ترین درخت خیال کیا جاتا ہے۔ اس کا نام

سنہری باتیں

- جو شخص اپنا راز پوشیدہ رکھتا ہے، وہ گویا اپنی سلامتی کو قبضے میں رکھتا ہے۔
- جو دوسروں کے غم سے بے غم ہے، آدمی کہلانے کا مستحق نہیں!
- جس کے ہاتھ تلوار نہیں اٹھا سکتے وہ کبھی عزت کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔
- ماں وہ صدف ہے، جس کے سینے میں حقیقی محبت کا چمکدار موتی چھپا ہے۔
- دشمن سے زیادہ خطرناک وہ ہے جو دوست بن کر دھوکہ دے!
- اس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں کہ کسی کو بلا وجہ تنگ کیا جائے!

مرسلہ ...... پرنس عمر ریاض ساگری، جہلم

"فاونڈرز ٹری" ہے اس کی اونچائی ایک سو دس میٹر سے زیادہ ہے۔

بعض ماہرینِ نباتات کا خیال ہے کہ زمانۂ قدیم میں آسٹریلیا میں پائے جانے والے سفیدے کے درخت بھی کیلفورنیا کے ریڈووڈ کی طرح بلند ہوں گے لیکن آج کل اس نسل کے جو درخت پائے جاتے ہیں وہ اوسطاً پندرہ میٹر چھوٹے ہوتے ہیں۔

ریڈووڈ کی طرح بلند دو قسم کے درخت پائے جاتے ہیں۔ ایک کا نام "ڈگلس کا صنوبر" ہے اور دوسرا ایک خاص قسم کا صنوبر ہے جو ۹۱ میٹر تک بلند ہوتا ہے۔ درخت کی جڑیں زمین سے پانی اور دھاتوں کے مادے ہی حاصل نہیں کرتی بلکہ درخت کو مضبوطی سے پکڑے بھی رکھتی ہیں۔ اسی طرح بڑے بڑے درختوں کی جڑیں زمین میں اندر تک دھنسی ہوتی ہیں تاکہ ان کو جکڑے رکھیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ ایک درخت اپنی شاخوں اور پتوں کو ملا کر جتنا زمین کے اوپر پھیلتا ہے اس کی مناسبت سے اس کی جڑیں اتنی ہی جگہ زمین کے نیچے گھیر لیتی ہیں۔

سائنسدان کسی درخت کی عمر اس کی لکڑی کے حلقے گن کر بتا دیتے ہیں۔ درخت کے تنے کو کاٹ دینے سے لکڑی میں بنے ہوئے بہت سے حلقے نظر آتے ہیں۔ درخت کی چھال کے نیچے ہر سال لکڑی کے گودے میں ایک نیا حلقہ بن جاتا ہے بعد ازاں یہ نیا حلقہ یا تہہ ایک چھلّے کی شکل اختیار کر لیتا ہے لہٰذا درخت کے تنے کا ہر نیا حلقہ ایک سال کی عمر کو ظاہر کرتا ہے اور جب حلقے بنتے چلے جاتے ہیں تو تنا بڑھنے لگتا ہے۔

درخت کے صرف تنے ہی میں حلقے نہیں بنتے بلکہ شاخوں میں بھی حلقے پائے جاتے ہیں۔ ہر سال شاخ کی چوٹی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے کیونکہ درخت کی لمبائی کی بڑھوار صرف اوپر کی چوٹی میں ہوتی ہے اس لئے بقیہ شاخیں زمین سے ہمیشہ اتنی ہی بلند رہتی ہیں جتنی کہ ابتدا میں تھیں۔

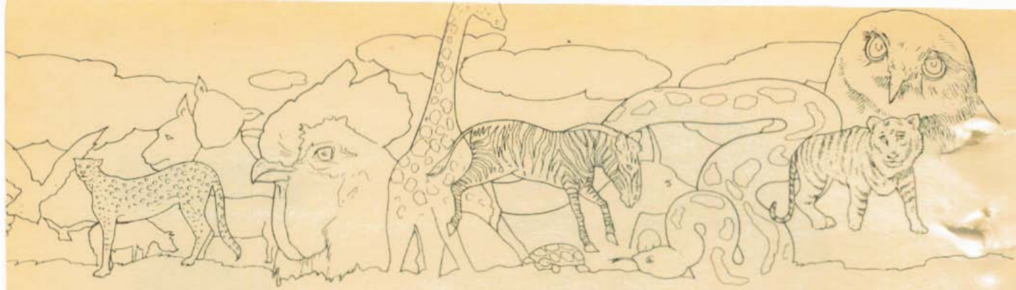

جانوروں کے نام

اشعار میں تلاش کیجیے.

محمد بن مالک محمدی

(۱) اک شے رکھی ہے سامنے، کیا اس کا نام ہے؟
ہاں ہاں سمجھ گئے تم، کہہ دو وہ آم ہے

(۲) اس سر زمیں میں ہم کو ملتی ہے کتنی راحت
یوں ہی رہے کراچی تابندہ تا قیامت

(۳) اس چمن زارِ وطن کی دیکھئے گُل کاریاں
کِھل رہے ہیں گُل، ہری ہیں خوبصورت کیاریاں

(۴) صبح کا جلوہ ہوا بیدار سارے ہوگئے
لو قمر غائب ہوا، معدوم تارے ہوگئے

(۵) اس باکسر کو دیکھو کیا گل کھلا رہا ہے
کیسا نپا تلا وہ مُکا لگا رہا ہے

(۶) بن جائے گا گلے کا یہی طوق سیم و زر
اُف ہر بخیل ہو گا پشیماں بروزِ حشر

(۷) آج لالو کھیت سے ہم ٹیکسی میں آئے ہیں
پیارے پیارے کچھ پرندے ساتھ اپنے لائے ہیں

(۸) بہتات ہے چوروں کی بند رکھنا دروازہ
چوری نہ کہیں کر لے آکر کوئی آوارہ

(۹) ان سے کہو کہ موزے برآمدے میں ہیں
ٹوپی ہے الگنی پر، پیسے بڑے میں ہیں

(۱۰) میں نے مشاعرے میں جاکر غزل سنائی
کچھ واہ واہ سن کر تھوڑی سی داد پائی

جوابات انہی صفحات پر تلاش کیجئے!

چیزوں کی کہانی

صابن

آصف فرخی

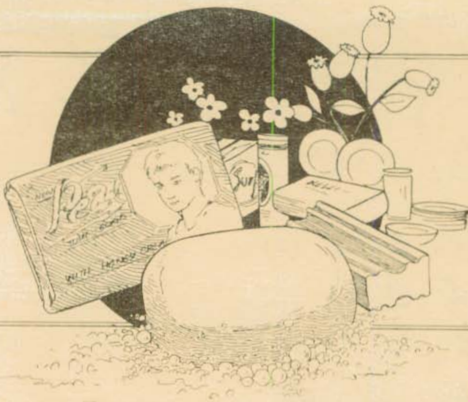

جو بچے نہانے دھونے سے گھبراتے ہیں، وہ یہ معلوم کر کے حیران رہ جائیں گے کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ موجود ہیں جو کبھی نہیں نہاتے۔ دنیا کے بعض علاقوں اور معاشروں میں نہانے کا رواج نہیں ہے۔ یہ بات زیادہ پرانی نہیں ہے کہ تبت میں کیا امیر کیا غریب، کیا عورت کیا مرد، کیا چھوٹا کیا بڑا، کبھی بھی نہاتا نہیں تھا۔ ان لوگوں کے لئے نہانے کا تصور ہی عجیب سا تھا۔ قطب شمالی کے یخ بستہ برفانی علاقوں میں رہنے والے اسکیمو بھی صفائی کے لئے پانی کے استعمال سے گھبراتے تھے، اور تو اور، پچھلی صدی تک امریکا کے بعض علاقوں میں لوگ اسی وقت نہاتے تھے جب ڈاکٹر انہیں نہانے کا مشورہ دیتا تھا۔

کچھ لوگ پانی سے نہانا پسند کریں یا نہ کریں، لیکن تاریخ کے ہر دور میں اور تقریباً ہر قوم کے افراد نے کسی نہ کسی طریقے سے اپنے آپ کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کی ہے۔

پانی سے نہانے سے تو ہم سب بخوبی واقف ہیں۔ بعض علاقوں میں بھاپ سے نہانے کا رواج رہا ہے۔ قدیم آزٹیک باشندے، فن لینڈ کے لوگ اور ترکی کے باشندے نہانے کے لئے یہ طریقہ اختیار کرتے کہ گرم کئے ہوئے پتھروں پر ٹھنڈا پانی ڈالتے اور اس سے جو بھاپ نکلتی تو اس میں اپنے جسم کو صاف کر لیتے۔ ایسے غسل خانوں کو حمام کہا جاتا تھا۔ ترکی میں یہ طریقہ اتنا مقبول تھا کہ یورپ اور امریکا کے لوگ بھاپ سے نہانے کے اس طریقے اور ایسے غسل خانوں کو "ترکی غسل" کہنے لگے۔ اس مقصد کے لئے بنائے جانے والے بڑے بڑے غسل خانوں کو "سَونا" (SAUNA) بھی کہتے ہیں۔

قدیم آشوریہ کے دولت مند صبح سویرے اٹھ کر اپنے جسم پر تیل کی مالش کر لیتے تھے اور اسی کو کافی سمجھتے تھے۔ اس کے برخلاف مصر میں ابتدائی زمانے سے ہی غسل خانے استعمال ہوتے آئے تھے

اور ہر گھر میں نہانے کی جگہ موجود ہوتی تھی۔ یونان کے لوگ روزانہ نہانے کے عادی تھے۔ وہ نہانے کے ساتھ ساتھ ہاتھ اور پاؤں رگڑ رگڑ کر صاف کرتے اور اس مقصد کیلئے جھانوے استعمال کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ خوشبودار مسالے لگاتے تھے۔ بعض لوگ پودوں سے نکلنے والے جھاگ دار مادے سے نہاتے تھے۔

فرانس کے علاقے میں ہزاروں برس پہلے بسنے والے قبائلیوں نے صفائی کیلئے ایک نئی اور بڑی کارگر چیز ڈھونڈ نکالی۔ وہ بکری کی چربی، چکنی مٹی اور پوٹاش کو ملا کر استعمال کرتے تھے۔ اس چیز کا نام انہوں نے "ساپو" رکھا تھا جس سے آج کا لفظ سوپ نکلا ہے۔ یہ صابن کی ابتدائی شکل تھی، مگر اس کا استعمال عام نہیں ہونے پایا۔ ان قبائلیوں کے بنائے ہوئے صابن سے روم کے لوگ بھی واقف تھے، مگر وہ اس کے استعمال کے قائل نہیں تھے۔

اس زمانے میں صاف پانی کی فراہمی بہت بڑا مسئلہ تھی۔ اونچی نالیوں کے ذریعے روم کے معمار عام حمام تک پانی لے کر جاتے تھے۔ یہ حمام قدیم روم کے معاشرے میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ معمولی سی رقم ادا کر کے کوئی بھی شہری حمام میں داخل ہو سکتا تھا اور اس کی بہت سی سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ آپ چاہیں تو گرم پانی کے تالاب میں تیریئے، نہایئے یا مالش کروایئے۔ جی چاہے تو انتظار کے کمروں میں کوئی کھیل کھیلئے یا کتاب پڑھ لیجئے۔ اور اگر کچھ بھی نہ کرنے کو جی چاہے تو حمام کے گرد پھیلے ہوئے باغوں میں دھوپ کھایئے۔

روم کے زوال کے ساتھ ساتھ حمام بھی ختم ہو گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ مغربی دنیا نے نہانے دھونے کا تکلف ہی اٹھا دیا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے یوروپ میں لوگ نہائے بغیر ہی کام چلاتے تھے۔ لیکن ہر پادری کو باقاعدہ ہاتھ اور صاف کرنا پڑتا اور کرسمس اور ایسٹر کے دن نہانا ضروری تھا۔ باقی اُمرا یہ کرتے کہ لکڑی کے بڑے سے حوض میں بیٹھ جاتے اور پانی کی دو چار بالٹیاں اپنے اوپر گروا لیتے۔

مغرب میں نہانے کا رواج دوبارہ جو پھیلا تو صلیبی جنگوں میں حصہ لینے والے فوجیوں کی وجہ سے پھیلا، جنہوں نے مشرق وسطیٰ میں آکر نہانے کی عادت اختیار کر لی۔ مشرق کے ملکوں میں نہانے کا رواج زیادہ پرانا تھا۔ ہندوؤں کے رسم و رواج میں اشنان کرنے یعنی نہا دھو کر صاف ہونے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ مسلمان، نماز پڑھنے کیلئے دن میں پانچ دفعہ وضو کرتے آئے ہیں۔

صلیبی جنگوں کے ان سپاہیوں نے ازمنۂ وسطیٰ کے یوروپ کو نہانے سے متعارف کرایا۔ بہت سے شہروں میں عام حمام بنوائے گئے جہاں شہر کے لوگ اجتماعی طور پر نہاتے۔ نہانا، یورپ میں اتنا مقبول ہوا کہ فیشن بن گیا۔ اور امراء اپنے پانی کے حوض میں بیٹھے بیٹھے ہی مہمانوں سے ملاقات بھی

جہاں بھی جاؤ موت آ کر رہے گی

روایت ہے ضشیمہ ؓ سے کہ ملک الموت ایک بار حضرت سلیمان علیہ السلام کی مجلس میں آئے اور ایک شخص کی طرف تعجب سے کچھ دیر دیکھتے رہے. جب ملک الموت چلے گئے تو اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے پوچھا. یہ کون شخص ہے؟ آپ نے فرمایا ملک الموت .اس نے کہا وہ میری طرف اس طرح دیکھتے تھے گویا میری روح قبض کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ سلیمان ؑ نے فرمایا. تو کیا چاہتا ہے؟ اس نے کہا مجھے ہندوستان پہنچا دیجئے۔ آپ نے ہوا کو حکم دیا کہ اس کو اٹھا کر ہندوستان میں رکھ دے۔ ہوا نے اس کو ہندوستان پہنچا دیا۔ پھر ملک الموت حضرت سلیمان علیہ اسلام کے پاس آئے۔ آپ نے پوچھا. تم کیوں اس شخص کو تعجب سے دیکھ رہے تھے؟ کہا مجھے اس بات پر تعجب تھا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم میرے پاس پہنچا ہے کہ اس کی روح ہندوستان میں قبض کرو اور یہ آپ کے پاس بیٹھا ہے۔"

عدیل احمد جلیل۔ (گاڑی کھاتہ حیدر آباد)

کر لیتے

کچھ لوگ تو ایسے بھی تھے جن کے لئے پانی سے نہانا کافی نہیں تھا۔ بعض مشہور بادشاہ شراب سے نہاتے، اور تاریخ میں ایک آدھ ایسی ملکہ کا ذکر بھی ملتا ہے جو دودھ سے نہاتی تھی۔

تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ کلیسا اتنی زیادہ صفائی کو پسند نہیں کرتا تھا اور سترھویں صدی میں ڈاکٹروں نے بار بار نہانے کو صحت کیلئے خطرہ قرار دے دیا۔ اس لئے نہانے کا فیشن خود بخود ختم ہو گیا۔

اس زمانے میں پانی کی ہر بالٹی کے لئے تالاب یا کنویں کا پھیرا کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے پانی کی کفایت کے مارے لوگوں نے نہانا کم کر دیا۔ اٹھارہویں صدی تک یہ حال تھا کہ امراء بھی منہ دھونے یا نہانے کے زیادہ قائل نہیں تھے، بس کوئی گیلا کپڑا کبھی کبھار منہ پر پھیر لیتے۔ عطر اور پاؤڈر خوب لگاتے تاکہ جسم سے بو نہ آئے۔

دھیرے دھیرے خوب اچھی طرح منہ دھونے اور نہانے کا رواج پڑ گیا۔ چھٹی والے دن نہا دھو کر آگ کے سامنے بیٹھنے کا دستور ہو گیا اور اکثر گھریلو مسالے اور صابن صفائی کے لئے استعمال ہونے لگے۔ انیسویں صدی تک ہر گھر میں منہ دھونے کے لئے پانی سے بھرا برتن اور تسلہ رہتا تھا۔

برصغیر میں پانی کی فراوانی بھی رہی ہے اور صفائی کے لئے نہانا دھونا لازمی سمجھا جاتا رہا ہے۔ سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن نے "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے" میں لکھا ہے کہ ہندو مرد اور عورتیں زیادہ تر کھلی فضا اور بہتے پانی میں نہانا پسند کرتے، جبکہ مسلمان اپنے گھروں میں نہانے کے لئے بند جگہ بنواتے اور اس طرح غسل خانوں کا رواج مسلمانوں کی آمد کے بعد ہوا۔

شاہی وقت کی عمارتوں اور قلعوں میں بڑے بڑے حمام بنے ہوئے ہیں۔ خوبصورت آرائش

سے مزیّن ان حماموں میں ٹھنڈے اور گرم، دونوں طرح کے پانی کا اہتمام تھا۔ دہلی کے لال قلعہ میں جو حمام ہے، اس کے تین درجے ہیں۔ پہلے درجے میں کپڑے بدلے جاتے ہیں اور دوسرا درجہ سرد خانہ کہلاتا ہے، جس کے بیچ میں حوض ہے اور چاروں طرف فوارے۔ تیسرا درجہ گرم خانہ کہلاتا ہے۔ اس کا ایک کمرہ "گرم آبہ" کہلاتا ہے، جو ایک توے کے ذریعہ گرم رہتا تھا۔ حمام میں جابجا نہریں تھیں اور فواروں کے ذریعے ہر کمرے میں پانی پہنچتا تھا۔

بادشاہوں کے علاوہ عوام کے لئے بھی حمام موجود تھے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں حمام موجود تھے اور حمام میں غسل کرنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ مغلوں کے عہد میں صرف آگرہ شہر میں آٹھ سو حمام تھے جن میں حکیم ابوالفتح گیلانی کا حمام بہت مشہور تھا۔

صابن کا ذکر اکبر بادشاہ کے زمانے میں بھی ملتا ہے، لیکن نہانے کے لئے صابن اچھے نہیں سمجھے جاتے تھے بلکہ کپڑے دھونے میں استعمال ہوتے تھے۔ نہانے کیلئے ہڑ، آملہ اور صندل استعمال کئے جاتے۔ عورتیں ملتانی مٹی سے بال دھوتیں، نہانے میں خوشبودار مسالے استعمال ہوتے اور سر میں تیل لگانے کا عام رواج تھا۔

اب سے پچاس، پچھتّر برس پہلے کا ذکر کرتے ہوئے شاہد احمد دہلوی نے لکھا کہ "کھلی منہ ہاتھ دھونے کے کام آتی تھی۔ کھلی، اُبٹنے اور بیسن کے زمانے کبھی کے لد گئے۔ اب تو طرح طرح کے صابن ہیں، جن سے جلد کو نقصان تو پہنچ سکتا ہے، فائدہ مطلق نہیں پہنچتا۔ عورتیں آنولوں، ریٹھوں، ملتانی مٹی، سیکاکائی اور دہی سے بال دھویا کرتی تھیں۔ ان سے بال بڑے اور چمکدار ہو جاتے تھے۔"

کھلی، بیسن اور اُبٹن کا رواج تقریباً ختم ہو گیا ہے اور غسل خانے میں صابن کی حکمرانی ہے۔

پیارے قارئین!

محکمہ ڈاک نے گزشتہ فروری میں ایک حکم نامے کے ذریعے بیرونِ ملک ڈاک کی شرح میں چار گنا اضافہ کر دیا ہے جس کے سبب آئندہ امریکہ، کنیڈا اور یورپ میں آنکھ مچولی کا زرِ سالانہ ۵۰۰ روپے پاکستانی اور مشرقی وسطیٰ اور ایشیا میں ۴۰۰ روپے ہو گا۔

ہمیں امید ہے کہ آپ اس اضافہ کو ہماری مجبوری جانتے ہوئے قبول فرمائیں گے اور آپ کا بیش قیمت تعاون ہمیں آئندہ بھی حاصل رہے گا۔

وہ کون تھی

عفیفہ ابراہیم

اکثر اوقات سردیوں میں جب گھر کے سب بڑے، بوڑھے اور بچے انگیٹھی کے سامنے ہاتھ تاپنے بیٹھتے ہیں تو بچے بوڑھوں سے ان کی زندگی کا کوئی واقعہ سنانے کی فرمائش کرتے ہیں۔

وہ بھی سردیوں کی ایک شام تھی ہم سب بچے دادا جان کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے اور ان سے کوئی اچھا سا قِصّہ سُنانے کی فرمائش کر رہے تھے، دادا جان نے پہلے تو ہم سب کو خاموش کروایا اور پھر بولے۔

"لو سنو...... پاکستان بننے سے پہلے ہم لوگ دہلی میں رہتے تھے۔ ہمارا گھر ایک پرانے محلے میں تھا۔ میری عمر اس وقت یہی کوئی پندرہ سولہ سال ہو گی۔ ان دنوں میں میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ ہمارا ایک گھریلو ملازم بھی تھا۔ اس کا نام بِلّو تھا۔ بِلّو میرا ہم عمر تھا۔ اس کے والدین بچپن میں فوت ہو چکے تھے۔ وہ خوش مزاج اور محنتی لڑکا تھا۔

گھر میں سب سے زیادہ بلّو کی مجھ سے دوستی تھی۔ وہ سینما کا بڑا شوقین تھا۔ ایک بار اس نے کوئی فلم دیکھ لی پھر تو جیسے اسے چسکا پڑ گیا۔ کیوں کہ رات کو گھر کا کام ختم کرنے میں اسے دیر ہو جاتی اس لئے وہ رات کو فلم کا سب سے آخری شو دیکھتا۔ اورچونکہ میں جاگ کر تیاری کر رہا ہوتا تھا اس لئے اُٹھ کر رات کو اس کے لئے دروازہ کھول دیتا تھا۔

یہ دسمبر کی ایک سرد رات تھی۔ بلّو نے کام ختم کیا اور فلم دیکھنے چلا گیا۔ میں بھی اپنی کتابیں لے کر پڑھنے بیٹھ گیا۔

ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا کہ دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ بلّو بڑی تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس نے فوراً دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ میں اس کی حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ سر سے خون بہہ رہا تھا اور شلوار کا ایک پائنچہ پھٹا ہوا تھا۔ وہ حد درجہ خوف زدہ تھا۔ وہ آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے اسے پانی پلایا۔ اس کے سر سے خون صاف کر کے زخم پر پٹی باندھی اور پوچھا کہ یہ سب کیسے ہوا۔ وہ پہلے تو خوف زدہ حالت میں دروازے کو تکتا رہا اور پھر خوف زدہ لہجے میں بولا "میں فلم دیکھ کر واپس آرہا تھا کہ راستے میں مجھے ایک بُڑھیا کھڑی دکھائی دی۔ اس نے اپنے سر پر بڑی سی ایک گٹھڑی اٹھا رکھی تھی بُڑھیا کو دیکھ کر میں نے ازراہِ ہمدردی اس سے پوچھا کہ اماں تمہیں کہاں جانا ہے۔ لاؤ اپنا سامان مجھے دے دو میں تمہیں پہنچا آتا ہوں۔ بُڑھیا بولی "بیٹا اگلے محلّے تک جانا ہے۔" میں نے بُڑھیا سے گٹھڑی لے لی اور چُپ چاپ اس کے پیچھے چلنے لگا۔ دو محلّے چھوڑ کر وہ ایک مکان کے سامنے رک گئی اور بولی "یہ میرا گھر ہے۔" وہ ایک پُرانا مکان تھا۔ ہم اس مکان میں داخل ہوئے۔ اس نے گٹھڑی لے کر چولہے کے پاس رکھ دی۔ اور بولی "بیٹا! ابھی نہ جاؤ۔ جاتے وقت میں چاول پکا کر رکھ گئی تھی۔ وہ کھاتے جانا۔" میں وہیں چولہے کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لباس تبدیل کر کے واپس آئی۔ چاند کی ہلکی روشنی میں میں نے اسے دیکھا تو حیران رہ گیا وہ اچانک ایک جوان اور خوب صورت عورت میں بدل گئی تھی۔ پہلے میں یہ سمجھا کہ شاید روشنی کم ہونے کی وجہ سے مجھے دھوکا ہو رہا ہے۔ وہ چولہے پر پلاؤ گرم کرنے لگی۔ چاول ہمیشہ سے میری کمزوری رہے ہیں۔ دوسرے رات بھی بہت ہو گئی تھی اس لئے چاولوں کو دیکھ کر میری بھوک چمک اُٹھی۔ اس نے ایک بڑی پلیٹ میں چاول ڈال کر دیئے اور دوسری پلیٹ میں خود کھانے لگی۔ چاول کھاتے کھاتے میں نے بوٹی کی تلاش میں پلیٹ میں اِدھر اُدھر ہاتھ مارا تو میرا ہاتھ ایک بوٹی سے ٹکرایا۔ میں نے اسے اُٹھایا تو وہ کسی انسان کی اُنگلی تھی۔ اُنگلی کو دیکھتے ہی خوف کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ اُنگلی میرے

ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور میں اُٹھ کر اندھا دھند بھاگنے لگا۔ وہ عورت ایک مکروہ قہقہہ لگا کر بولی "ٹھہرو اپنی اُنگلی تو لیتے جاؤ"۔ اس کے ساتھ ہی اس نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے اپنے پاس پڑا ہوا پیتل کا گلاس مجھے کھینچ مارا لیکن میں نہ رکا اور اندھا دُھند بھاگتا گیا۔ بھاگتے ہوئے میری شلوار کا پائنچہ دروازے کی چوکھٹ میں پھنس گیا لیکن میں پھر بھی نہ رُکا اور اس کے بعد میں نہ جانے کیسے یہاں تک پہنچا" یہاں تک کہہ کر بلّو خاموش ہو گیا۔ میں نے بلّو کو تسلّی دے کر لٹا دیا لیکن اس کے بعد میں ساری رات نہ سو سکا۔ صبح سارا قصّہ ابّا کو بتایا۔ وہ بولے کہ یہ بلّو کا وہم ہو سکتا ہے۔ لیکن بلّو کے بار بار کے اصرار پر ابّا نے چچا کو ساتھ لیا جو دوسرے محلّے میں رہتے تھے اور بلّو کے ساتھ وہ بُڑھیا کا مکان دیکھنے گئے۔

وہ نہایت پُرانا اور بوسیدہ مکان تھا۔ وہاں کہیں بھی زندگی کے آثار نہ تھے۔ وہ چولہا جس کے پاس بیٹھ کر بلّو نے چاول کھائے تھے۔ اس پر مکڑیوں نے جالے بنے ہوئے تھے۔ لیکن ابّا یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ دروازے کی چوکھٹ میں نیلے رنگ کا کپڑا پھنسا تھا۔ بے شک یہ بلّو کی شلوار کا ٹکڑا تھا۔ اور اس سے کچھ آگے پیتل کا ایک گلاس پڑا تھا۔ پیتل کا گلاس نیچے سے گولائی میں نوک دار ہوتا ہے اور بلّو کے سر پر گولائی میں زخم کا نشان تھا۔ یہ سب باتیں مل کر بلّو کو سچ ثابت کر رہی تھیں۔ اس معمّے کو حل کرنے کے لئے ابّا نے پڑوسیوں سے پوچھا کہ یہاں کوئی رہتا تو نہیں۔ تو انہوں نے بتایا کہ یہ مکان برسوں سے غیر آباد ہے۔ انہوں نے پڑوسیوں کا شکریہ ادا کیا اور پھر واپس آ گئے۔ اس واقعے کے بعد بلّو اپنے آبائی گاؤں چلا گیا اور یہ معمّہ کبھی حل نہ ہو سکا کہ "وہ کون تھی"۔

ساتھی توجّہ فرمائیں!

قلم قبیلے صفحات میں شامل "سوالات کا انعامی مقابلہ" (منعقدہ اپریل ۱۹۹۳ء) میں انعامی سوالوں کے جوابات ارسال کرنے کی تاریخ بڑھا دی گئی ہے۔ اب ساتھی اپنے جوابات ۸ رمئی ۱۹۹۳ء تک روانہ کر سکتے ہیں۔

انچارج "سوالات کا انعامی مقابلہ"
ماہنامہ آنکھ مچولی - ۱- پی آئی بی، کالونی، کراچی نمبر۵، کوڈ ۷۴۸۰۰

جوابات (جانوروں کے نام)

(۱) شیر (۲) چیتا (۳) گلہری

(۴) مرغا (۵) سانپ (۶) زرّافہ

(۷) الّو (۸) بندر (۹) زیبرا

(۱۰) کچھوا

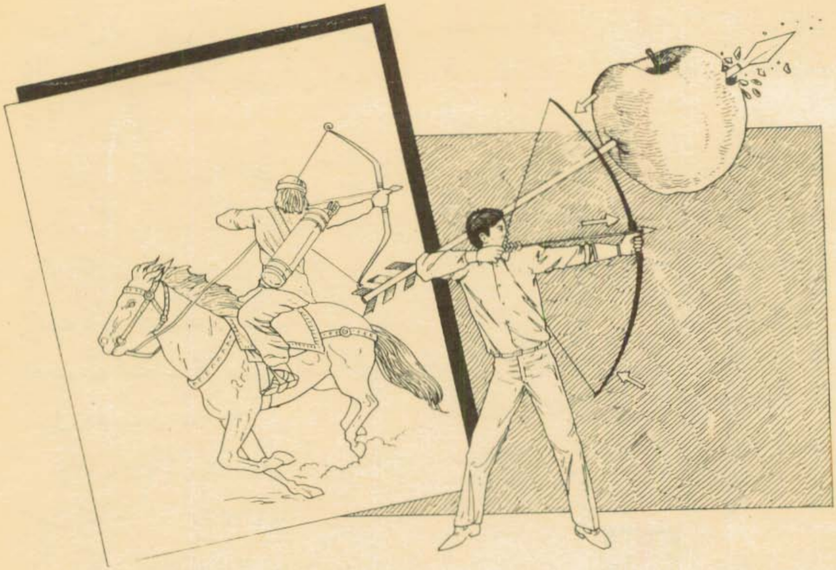

فن تیراندازی کا

شیخ ظل ہما حمید

بندوق کے ایجاد ہونے سے تیر کمان کو لوگ بھول گئے تھے اور یہ بھی ہے کہ بندوق اور رائفل کے مقابلے میں تیر کمان بہت معمولی ہتھیار ہے لیکن تیراندازی کا شوق پچھلے بیس تیس سال میں پھر ترقی کر گیا ہے۔ اور مہذب ملکوں میں تیر اندازی کے باقاعدہ کلب اور انجمنیں قائم ہو گئی ہیں جہاں پُرانے زمانے کے اس فن کو دوبارہ مقبولیت اور رونق مل رہی ہے۔

پُرانے زمانے میں تیراندازی ایک بہت ہی مُفید ہنر تھا۔ کیوں کہ دشمن کو ہلاک کرنے اور شکار کھیلنے کے لئے اسی ہنر سے کام لیا جاتا تھا۔ بعض اچھے نشانچی بڑی آسانی سے سو گز کے فاصلے سے شکار کر لیتے تھے۔ بعض ماہر تیر انداز اُڑتے ہوئے پرندوں کو بھی گرا سکتے تھے۔ دشمن کو دور رکھنے اور قریب آنے سے پہلے ہی اسے ہلاک کر دینے کے لئے تیر بہت بے خطا ہتھیار تھا۔ اسلامی

حکومت کے عروج میں عرب کے تیر اندازوں کا بہت دخل تھا کیوں کہ ان کی تچی نشانہ بازی اور پُھرتی سے تیر چلانے کی صلاحیت دشمن کو بہت جلد تتر بتر کر دیتی تھی۔

جناب رسالت مآب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے باپ کے فرائض میں سے دو فرض یہ بھی مقرّر کئے ہیں کہ وہ اپنے بیٹے کو تیرنے اور تیر چلانے کا ہُنر سکھائے۔ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے تحت اب تیر اندازی کی جگہ رائفل اور بندوق نے لے لی ہے۔

پاکستان و ہند میں تیر اندازی کا فن دو ڈھائی صدی پہلے تک زندہ تھا۔ یہاں کے بعض کمان دار دو تین میل کے فاصلے پر تیر پھینک سکتے تھے۔

برطانیہ میں باکمال تیر انداز موجود تھے۔ سوئٹزر لینڈ کے ایک دہقان ولیم ٹیل نے ۱۳۰۳ء میں پچاس قدم کے فاصلے سے اپنے بچّے کے سر پر رکھے ہوئے سیب کو دو ٹکڑے کر دیا تھا۔

آسٹریلیا کا ظالم گورنر جس نے ولیم ٹیل کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس کا یہ کمال دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اسے معاف کر دیا۔ پھر ولیم ٹیل سے اتنا کہا کہ اگر تمہارا تیر ذرا بھی خطا ہو جاتا تو معصوم بچّے کی موت یقینی تھی۔ ولیم ٹیل نے اپنے ترکش سے دوسرا تیر نکال کر دکھایا اور کہا کہ اگر وہ تیر خطا ہو جاتا تو یہ دوسرا تیر ہر گز خطا نہ ہوتا اور سیدھا تمہارے سینے میں پیوست ہو جاتا۔

بچّوں کے مشہور و معروف مُصنّف
اشتیاق احمد
کے سنسنی خیز،
ہنگامہ آرا،
مزاح اور جاسوسی
سے بھر پُور ناول

انسپکٹر جمشید سیریز
۳۹۴۔ چھوٹا مجرم ۱۰ روپے
۳۹۵۔ زندہ مقتول "
۳۹۶۔ آخری تیر ۲۱ "
۱۷۔ کیمرے کا راز ۲۱ "
۱۸۔ خونی جیل ۱۰ "

انسپکٹر کامران مرزا سیریز
۹۔ خونی دھماکے ۱۰ "
۹۔ انگلی کی قیمت

شوکی سیریز
۵۔ نیا آکہ دین پرانا چراغ ۱۰ "

کہانیوں کا نیا سلسلہ
۶۔ دوسرا چور ۴/۵۰ "
۷۔ خوفناک امتحان ۴/۵۰ "
۸۔ فون کی چوری ۴/۵۰ "

۲۰ رمئی ۱۹۹۳ء
کو آپ کے شہر میں
ہر بڑے بکسٹال پر دستیاب
یا
پھر براہِ راست خط لکھ
کر ادارے سے بذریعہ وی پی
منگوائیں

اشتیاق پبلی کیشنز
۹/۱۲ نصیر آباد، مُسلم پورہ، سانده کلاں
لاہور، فون ۳۲۱۵۳۷

کونٹیکٹ لینس

نظر کی کمزوری کے لئے عینک کا استعمال تقریباً سترہویں صدی عیسوی سے چلا آرہا ہے۔ پرانے زمانے کے عینک میں جو عدسے استعمال ہوتے وہ موٹے اور بھدّے ہوتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ اس میں ترقی ہوتی رہی اور اب عینک کے عدسے خوبصورت اور رنگین ہونے کے ساتھ ساتھ پائیدار بھی ہوتے ہیں۔

لیکن اب عینک کے علاوہ ایک اور چیز یعنی کونٹیکٹ لینس کا استعمال بھی عام ہے۔ فلم میں کسی بھی فرد (ہیرو، ہیروئن وغیرہ) کی آنکھوں کا رنگ تبدیل کرنے کے لئے کونٹیکٹ لینس کا استعمال کثرت سے ہو رہا ہے۔

اور اگر آپ کو اپنی آنکھوں کا رنگ پسند نہیں ہے تو یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے کونٹیکٹ لینس لگا کر آپ اپنی آنکھوں کا رنگ پسند کے مطابق تبدیل کر سکتے ہیں اور یہ لینس چند دنوں، ہفتوں یا عمر بھر کے لئے بھی لگائے جاتے ہیں جو عینک کی طرح اتارنے، پہننے اور ٹوٹنے سے بھی محفوظ ہوتے ہیں۔

کونٹیکٹ لینس پتلی جھلیوں کی مانند ہوتے ہیں جو آنکھ میں موجود رنگین مقام (سیاہ، نیلا یا سرخ وغیرہ) پر لگایا جاتا ہے البتہ اس میں جو لینس ہوتا ہے وہ انسانی آنکھ کی پتلی (Pupil) کے اوپر لگایا جاتا ہے۔ جو نظر کی کمزوری کے مطابق ہوتی ہے لیکن جو کونٹیکٹ لینس فیشن یا رنگ بدلنے کے لئے لگایا جاتا ہے، اس میں لینس یا عدسہ نہیں ہوتا بلکہ یہ صرف ایک جھلی پر مشتمل ہوتا ہے۔

کونٹیکٹ لینس کا خیال سب سے پہلے ایک انگریز طبیعیات دان "سر جون ہرشل" نے ۱۸۲۷ء میں پیش کیا۔ لیکن ۱۸۸۷ء تک یہ لینس بنانا ممکن نہ ہوسکے۔ البتہ ۱۸۸۷ء میں زیورخ کے "ڈاکٹر یوجین فِک" نے پہلی بار اس قسم کے عمدہ لینس (عدسے) بنائے تھے۔

اور تب سے اب تک ان لینسوں کا استعمال نہایت ہی محدود بنیاد پر جاری تھا۔ کیونکہ ان کے بے ضرر ہونے کے متعلق غیر یقینی صورت حال پائی جاتی تھی۔ جبکہ اب ان لینسوں کا استعمال عام ہوتا جارہا ہے۔

اور نظر کی کمزوری کے لئے استعمال ہونے کے علاوہ فیشن بھی بنتا جارہا ہے۔

مرسلہ ..... محمد انعام، کراچی

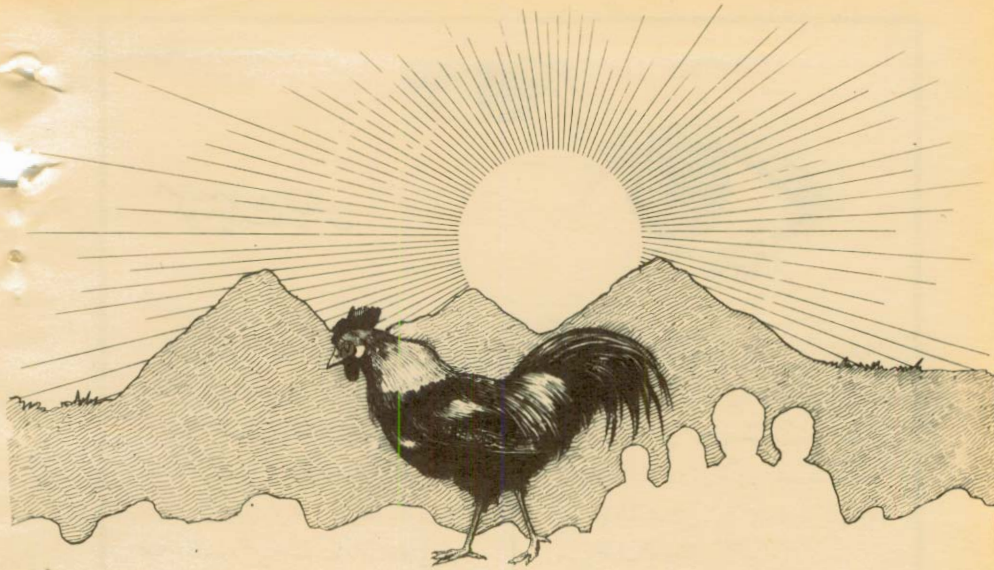

برازیل کی لوک کہانی

اگلے دن کے کھوجی

فرزانہ جبیں

ایک بار ایک تنہا مسافر انجان راستہ پر جا رہا تھا۔ جب دھند لکا تیزی سے بڑھنے لگا تو اسے رات گزارنے کی فکر ہوئی۔ چلتے چلتے اچانک مسافر کو ایک گھر نظر آیا۔ چنانچہ وہ اسی گھر کی سمت چل پڑا۔ جب وہ گھر کے نزدیک پہنچا تو اندر سے سب لوگ اس کے استقبال کے لئے نکل آئے۔ مسافر نے ان سے رات کو ٹھہرنے کی اجازت مانگی۔ میزبان بہت خوش اخلاقی سے پیش آئے اور مسافر کو کھانا وغیرہ کھلایا۔ کھانے کے بعد پورے گھر والے ایک جگہ [illegible] گئے اور کہیں جانے کی تیاری کرنے لگے

"اتنی رات گئے آپ لوگ کہاں جارہے ہیں؟"
مسافر نے حیرت سے پوچھا۔ گھر والوں نے بتایا،
"ہم کل کا دن تلاش کرنے جارہے ہیں۔" اور
پھر سب نے خالی بورے لئے اور باہر نکل گئے۔
آگے آگے باپ، پھر ماں اور ماں کے پیچھے بچّے
تھے۔ مسافر مہمان نے تھوڑی دیر تک کچھ سوچا اور
پھر وہ بھی ان کے پیچھے بھاگا۔ اصل میں وہ جاننا چاہتا
تھا کہ یہ لوگ دن کو تلاش کرنے کہاں جارہے
ہیں۔ صبح ہونے تک وہ لوگ بھاگتے رہے۔
جیسے ہی سورج کی کرنیں نکلیں، اس عجیب و غریب
خاندان کے افراد نے اپنے بورے خوب کس لئے
اور واپس مڑ گئے۔ جب وہ لوگ گھر پہنچے تو سویرا
ہوچکا تھا۔انھوں نے بورے کھولے اور صحن کے بیچ
میں انھیں ہلا ہلا کر خالی کر دیا۔

مسافر کو تجسّس ہوا کہ یہ لوگ بورے میں کیا لائے
تھے۔ اس نے گھر والوں سے پوچھا تو اسے بتایا گیا
کہ ہم دن لے کے آئے ہیں۔ "اگر ہم وقت پر
نہ پہنچیں تو صاف روشن دن سے ہماری ملاقات
نہیں ہوتی۔" مسافر نے صرف سر ہلایا اور اپنے
راستے پر چل پڑا۔ واپسی پر جب وہ گھر آیا تو ان
کے لئے ایک سفید مرغ لے کے آیا۔

مسافر نے کہا "میں آپ کو یہ مرغ تحفہ میں
دیتا ہوں تاکہ ہر رات آپ کو کل کے دن کی تلاش
کے لئے نہ جانا پڑے۔ جیسے ہی وہ پہلی بار بانگ
دے تو مطلب یہ ہوگا کہ دن ابھی دور ہے۔ اور
اگر دوسری بار بانگ دے تو سمجھیں کہ دن قریب
ہے اور تیسری بار بانگ دے تو سمجھ لیں کہ دن احاطہ
میں ہے۔ میزبان تحفے سے بہت خوش ہوئے۔
مسافر نے مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور رخصت
ہوگیا۔ اچانک میزبان کی بیوی نے کچھ سوچ کر کہا
"ہائے جی! ہم نے تو یہ پوچھا ہی نہیں کہ وہ کھاتا کیا
ہے۔ آخر ہم اس کو کھلائیں گے کیا؟" خاوند اس
مسافر کے پیچھے دوڑا "اے دوست ذرا بتانا کہ وہ
کھاتا کیا ہے؟" مسافر جو کل کا دن تلاش کرنے
والوں سے پہلے ہی تنگ آچکا تھا چڑ کر بولا "وہ
سب کچھ کھاتا ہے۔"

میزبان غمگین گھر واپس آیا۔ "ہائے کیسا
افسوس ہے!مرغ سب کچھ کھاتا ہے!اس طرح تو ایک
دن ہماری بھی نوبت آجائے گی۔ یہ نہ ہو کسی دن
یہ ہمیں بھی کھا جائے۔" بیوی ہاتھ پر ہاتھ مار کر
رونے لگی "چلو اسے جلدی سے ختم کرڈالیں۔"
بس پورے خاندان نے چھڑیاں اٹھائیں اور بے
چارے مرغ کے پیچھے پڑ گئے۔ مرغ بیچارہ دور
بھاگ گیا۔ کہتے ہیں تب سے آج تک اس گھر میں
ہر وقت بھاگ دوڑ مچی رہتی ہے۔ سب گھر والے
کل کے دن کی تلاش میں جمع ہوتے ہیں تاکہ اسے
اگلی صبح بورے میں لایا جاسکے۔ اور رہا مرغ تو وہ دور
دیس اڑ گیا اور وہ ابھی تک اپنی بانگ سے زمین پر صبح
کی آمد کا اعلان کرتا رہتا ہے۔ آپ نے بھی یقیناً
اس کی بانگ سنی ہوگی۔ شاید اسی لئے آپ کو اگلا
دن ڈھونڈنے کہیں دور نہیں جانا پڑتا۔

پہچانیے، کون سا پھل کس پودے کا ہے؟

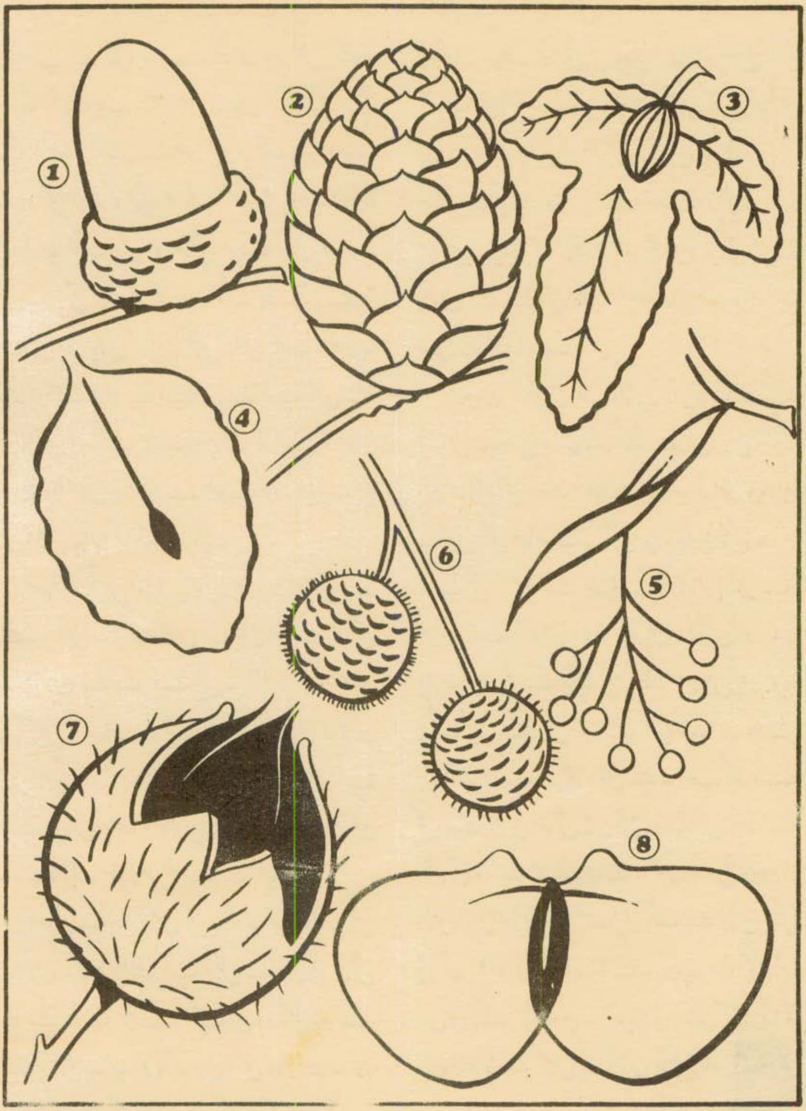

اصل حکمران

خلیفہ ہارون رشید کا ایک بیٹا ہوا کرتا تھا۔ اس کی عمر ۱۶ سال تھی۔ وہ عالموں اور زاہدوں کی محفل میں کثرت سے بیٹھا کرتا تھا۔

ایک دن وہ دربار میں آیا تو اس کے جسم پر ایک معمولی لنگی بندھی ہوئی تھی۔

وزیروں اور امیروں نے جب اسے اس حالت میں دربار میں دیکھا تو خلیفہ سے کہنے لگے کہ "آپ کا یہ بیٹا آپ کو رُسوا کروائے گا۔"

خلیفہ نے بیٹے سے کہا "بیٹے! کیوں مجھے رُسوا کرتا ہے؟" اس کے بیٹے نے زبان سے تو کچھ بھی نہ کہا مگر اس نے کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے پرندے سے کہا۔ "تجھے پیدا کرنے والے کی قسم آ اور میرے ہاتھ پر بیٹھ جا۔" وہ پرندہ اُڑتا ہوا آیا اور اس کے ہاتھ پر بیٹھ گیا۔ سب درباری بڑے حیران ہوئے۔ وہ اس طرح گویا ہوا۔

"بابا جان، عقل والوں پر حکومت کرنا تو کوئی کمال کی بات نہیں۔ عقل والے تو حکمران کی بات ضرور مانتے ہیں۔ اصل حکمران تو وہ خدا ہے جو انسانوں، جنوں، پرندوں، درندوں، چرندوں بلکہ، ہر شے پر حکومت کرتا ہے ہمارا اصل حکمران تو وہ ہے۔"

مرسلہ ...... عبیداللہ میمن، سکھر

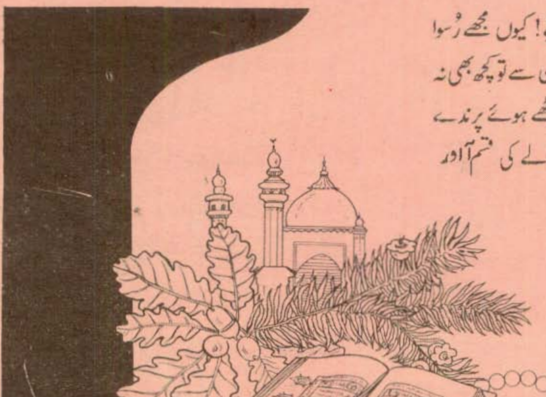

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

محمد اقبال سومرو، حیدرآباد

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جب حصولِ علم کے لئے اپنے گاؤں جیلان سے بغداد کے لئے روانہ ہوئے تو آپ کی والدہ ماجدہ نے زادِ راہ کے طور پر چالیس دینار آپ کی گدڑی میں سی دیئے اور چلتے وقت اپنے لختِ جگر کو نصیحت کی "بیٹا خواہ کیسی ہی مصیبت ہو اور بُرے حالات تمہیں پیش آئیں، سچ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا اور جھوٹ کے نزدیک بھی نہ پھٹکنا کیونکہ راست گوئی ہزار عبادتوں کی ایک عبادت ہے" سعادت مند بیٹے نے عرض کیا "اے پیاری ماں! میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہمیشہ آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا۔"

والدہ ماجدہ سے رخصت ہو کر حضرتؒ بغداد جانے والے ایک قافلے میں شامل ہو گئے کیونکہ اس زمانے میں جنگلوں بیابانوں میں لمبا سفر کرنا کسی تنہا آدمی کے لئے ممکن نہ تھا۔ راستے میں "ہمدان" سے کچھ آگے ڈاکوؤں نے قافلے پر حملہ کیا اور اہلِ قافلہ کا سب مال و اسباب لوٹ کر تقسیم کے لئے ایک جگہ جمع کر دیا۔

حضرت شیخ عبدالقادرؒ ایک طرف چپ چاپ کھڑے یہ دردناک نظارہ دیکھ رہے تھے کہ ایک ڈاکو آپ کی طرف بڑھا اور پوچھا "کیوں میاں لڑکے تیرے پاس بھی کچھ ہے؟" آپ نے فرمایا "ہاں میرے پاس چالیس دینار ہیں" ڈاکو کو آپ کی بات پر یقین نہ آیا اور وہ آپ کی ہنسی اُڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اتنے میں ایک دوسرا ڈاکو آپ کی طرف آیا اور وہی سوال کیا۔ آپ نے اسے بھی یہی جواب دیا کہ میرے پاس چالیس دینار ہیں۔ آپ کی غریبانہ حالت کو دیکھتے ہوئے دوسرے ڈاکو نے بھی آپ کی بات ہنسی میں اُڑا دی۔ ہوتے ہوتے یہ بات سبھی ڈاکوؤں میں پھیل گئی اور ان کے سردار احمد بدوی تک بھی پہنچ

گئی۔ اس نے حکم دیا کہ اس لڑکے کو میرے سامنے لاؤ۔ ڈاکو آپ کو اپنے سردار کے پاس لے گئے۔ سردار نے آپ سے پوچھا ”لڑکے سچ سچ بتا تیرے پاس کیا ہے؟“

آپ نے فرمایا ”میری بغل کے نیچے ایک گدڑی ہے جس میں چالیس دینار سلے ہوئے ہیں۔“ سردار کے حکم پر ایک ڈاکو نے آپ کی گدڑی اُدھیڑ کر دیکھی تو اس میں سے واقعی چالیس دینار نکل آئے۔ احمد بدوی نے حضرت سے پوچھا ”آخر کس چیز نے تمہیں سچ بولنے پر مجبور کیا؟“

آپ نے فرمایا ”میری والدہ نے گھر سے چلتے وقت نصیحت کی تھی کہ ہمیشہ سچ بولنا۔ بھلا ان چالیس دیناروں کی خاطر کیا میں اپنی والدہ کی نصیحت فراموش کر دیتا اور خدا کو ناراض کر لیتا۔“ آپ کے الفاظ سن کر احمد بدوی پر اتنا اثر ہوا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور اس نے کہا ”افسوس کہ میں نے اپنی ساری زندگی اپنے خالق کا عہد توڑتے ہوئے گزار دی۔ اے بچّے تم نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا۔ اب میں کسی کو تکلیف نہیں پہنچاؤں گا“ اپنے سردار کو دیکھ کر سب ڈاکوؤں نے بھی توبہ کر لی اور لوٹا ہوا تمام مال قافلے والوں کو واپس کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد احمد بدوی اور اس کے ساتھیوں نے لوٹ مار سے توبہ کر لی اور نیک انسان بن گئے۔

وہ دن یاد رہے گا!

عاصم کامل، کراچی

مجھے آج بھی اپنے اسکول میں جانے کا پہلا دن یاد ہے۔ اس وقت میری عمر نو دس سال ہوگی۔ پہلی تین جماعتوں کی کتابیں تو گھر ہی میں پڑھ چکا تھا اور اس دن چوتھی جماعت میں داخلے کی تیاری تھی۔ گھر کے لوگ مجھے اسکول بھجوانے کا

ضرورت سے زیادہ اہتمام کر رہے تھے حالاں کہ اسکول ہمارے گھر سے ذرا فاصلے پر تھا۔ اس کے باوجود اصطبل سے دو گھوڑوں والا تانگہ نکلوایا گیا جو ہمارے ابّو سال میں صرف دو بار عید گاہ جانے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ پھر بڑی بہنوں نے لاڈ میں آکر مجھے بہت ہی بھڑکیلے اور پُر تکلّف کپڑے پہنائے جو عام طور سے شادی بیاہ کے موقعوں پر پہنائے جاتے ہیں۔ سرخ مخمل کا کوٹ اور نیکر، پیازی رنگ کے موزے اور سفید جوتے۔ یہ مجھے اس لئے یاد ہے کہ اس دن جو کچھ مجھ پر گزری اس میں زیادہ ہاتھ اسی بھڑکیلے لباس کا تھا۔ میں اس پُر تکلّف لباس میں خود کو افضل سمجھ رہا تھا۔

جب براتیوں کی سی وضع قطع میں ہم گاڑی میں بیٹھے تو ایک ملازم بستہ اٹھائے ساتھ ہوا اور ہماری سواری فضل الرحمٰن اسکول کی پرانی دو منزلہ عمارت کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ کچھ لڑکے جو اسکول کے باہر کھڑے تھے، غُل مچاتے ہوئے اندر کو بھاگے۔ ایک دو استاد صاحبان ہڑبڑا کر باہر نکل آئے۔ میرا دل پہلے ہی دھک دھک کر رہا تھا۔ اس ہنگامے سے اور بھی اوسان خطا ہوئے، ملازم کے پیچھے پیچھے بہت مری ہوئی چال میں اسکول کے اندر قدم رکھا۔ ہر طرف سے بے شمار آنکھیں یوں گھورتی ہوئی نظر آتی تھیں جیسے کوئی چڑیا گھر کا جانور اسکول میں آگھسا ہو، چوتھی جماعت کے ماسٹر صاحب مجھے کلاس روم میں اپنے ساتھ لے گئے اور کہا

”جہاں دل چاہے بیٹھ جاؤ۔“

کراچی شہر اس وقت غریب تھا اور یہ اسکول بھی غریب، پڑھنے والے اور پڑھانے والی بھی مسکین سے تھے۔ مٹّی کے فرش پر کٹا پھٹا ٹاٹ بچھا ہوا تھا اور اس پر ویسے ہی پرانے کپڑے والے بہت سے بچّے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان میں جا کر بیٹھا تو سب سے الگ لگا۔ میرا دل چاہا کہ کوئی جن یا پری چُپکے سے میرے اچّھے کپڑے لے جائے اور مجھے اپنے ساتھیوں جیسا پھٹا ہوا کرتا پاجامہ لا دے، سارا دن اسکول کے بچّے مجھ پر فقرے اور پھبتیاں کستے رہے اور میرے ہم جماعتوں کی آنکھوں سے طنز اور حقارت ٹپکتی رہی، مجھے افسوس ہوا کہ زرق برق لباس اور ظاہری ٹھاٹ باٹ سے اپنے یا اپنے گھر والوں کے مال و دولت کی نمائش کرنا بہت ہی گھٹیا بات ہے۔ اس دن مجھے اپنے آپ پر بے حد غصہ آیا۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ آدمی ٹھیک سے خوش تبھی رہ سکتا ہے کہ اپنے ساتھیوں، دوستوں اور ہم وطنوں سے مل جل کر اور ان سا بن کر رہے۔ دوسروں سے الگ اور بڑھیا بن کر نظر آنے کا چاؤ ناپسندیدہ اور تکلیف دہ عمل ہے۔

اس دن کے بعد میں نے کبھی چھوٹوں پر افضل بننے کی کوشش نہیں کی۔

باجی دال

عنبرین ثاقب حسین

ہم اپنی چھوٹی پھوپھی کی شادی میں اپنی دادی کے گاؤں گئے۔

وہاں ہمیں رہتے ہوئے پانچ دن ہو گئے تھے۔ شادی کی تیاریاں بڑے زور و شور سے جاری تھیں۔ روز گوشت پک رہا تھا۔ ہم اور ہماری کزنز روز روز گوشت کھانے سے تنگ آ گئے تھے۔

آخر ہماری کزنز نے یہ فیصلہ کیا کہ آج شام دال پکائی جائے۔

اب سب نے سوچنا شروع کیا کہ کون سی دال پکائی جائے؟ ہماری بڑی پھوپھی کی لڑکی نے کہا "بھئی چنے کی دال پکانی چاہئے۔ بڑی لذیز ہوتی ہے۔"

اب مسئلہ تھا کہ دال کس کے گھر پکائی جائے اور دال کون پکائے گا؟ کیوں کہ کسی کو بھی دال پکانی نہیں آتی تھی۔ ہم نے شیخی میں آکر کہہ دیا کہ ہمیں دال پکانا آتی ہے اور ایسی لذیز دال بناتے ہیں کہ جو کھاتا ہے وہ تعریف کئے بغیر نہیں رہتا۔

چنانچہ دال منگوائی گئی اور دال پکانے کے لئے پھوپھی جان کا گھر منتخب کیا گیا۔

چھان پھٹک کر دال صاف کی گئی۔ پھر ہم نے چولہا جلایا جو کچھ دیر جلنے کے بعد بجھ گیا (یاد رہے کہ پھوپھی کے گھر لکڑیوں کا چولہا ہے)

ہم نے بڑی مشکلوں سے دوبارہ چولہا جلایا لیکن پھر بجھ گیا۔

"بھئی ہم سے تو نہیں جل رہا"

ہم نے ہار مان لی تو عالیہ نے بڑی مشکلوں سے پھونکیں مار مار کر چولہا جلایا۔

"چلو دال پکاؤ" عالیہ نے کہا تو ہم نے چولہے پر ہانڈی چڑھا دی۔ پکانا تو ہمیں آتا ہی نہیں تھا بس ایسے ہی شیخی مار دی تھی کہ ہم بہت اچھی دال پکا لیتے ہیں۔

بہرحال پھوپھی سے پوچھ کر دال میں مصالحہ وغیرہ ڈالا...... پھر گھی اور پانی ڈال کر دال گلنے کا انتظار کرنے لگا۔ پھوپھی اور ان کے بچّے بھی گوشت کھا کھا کر تنگ آگئے تھے۔ اب جو ہم نے دال پکانا شروع کی تو سب کہنے لگی کہ تمہارے ہاتھ کی دال کھائیں گے۔

یہ سن کر ہم فخر سے تن گئے اور لگے مزید شیخیاں بھگارنے کہ ہم سے اچھی کوئی دال پکا ہی نہیں سکتا۔ جو ایک بار ہمارے ہاتھ کی پکی ہوئی دال کھالے پھر وہ تمام زندگی انگلیاں ہی چاٹتا رہتا ہے۔

ہم اپنی کزنز اور پھوپھو سے باتیں بھی کرتے جا رہے تھے اور بار بار ہانڈی میں ڈوئی مار مار کر دال کو دیکھتے بھی جارہے تھے کہ دال گلی کہ نہیں۔ دو گھنٹے ہو گئے تھے۔ ہم بالٹی بھر پانی ہانڈی میں انڈیل چکے تھے لیکن دال تھی کہ گلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

ادھر بھوک کے مارے سب کا بُرا حال تھا۔ خود ہمارے پیٹ میں بھوکے چوہے سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ رہے تھے۔

خدا خدا کر کے دال پکی تو سب نے کھانا شروع کیا۔ سب کھا رہے تھے اور اپنے اپنے ریمارکس دے رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

"دالی گلی نہیں!"

کوئی کہہ رہا تھا۔ "پتہ نہیں کیا چیز بنی ہے؟"

پھوپھی جان نے تو ہمیں شرمندہ ہی کر دیا۔ کہنے لگیں۔

"عنبرین کیا شہر میں اسی طرح کی دال پکتی ہے؟"

ہم کیا جواب دیتے۔ خاموشی سے سر جھکائے دال چبانے کی کوشش میں مصروف رہے۔

رات کو سب کے پیٹ میں شدید درد اٹھا۔ ہم بھی ان درد کے ماروں میں شامل تھے۔

سب کو ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا ڈاکٹر صاحب نے دوا دی اور بتایا کہ سخت قسم کی دال کھانے سے سب کی یہ حالت ہوئی ہے۔

واپسی پر سب ہمیں چڑا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آئندہ تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی کوئی چیز نہیں کھائیں گے۔

اب کبھی جب ہم گاؤں جاتے ہیں تو کوئی بھی ہمیں ہمارے نام سے نہیں پکارتا بلکہ سب "باجی دال" کہہ کر چڑاتے ہیں۔

المیہ

"ارے، کچھ سنا؟"

"کیا؟"

"اسلم مر گیا؟"

"کون اسلم؟"

"ارے وہی جو لُنڈے بازار میں کندھے پر کوٹ ڈال کر بیچا کرتا تھا۔"

"ارے کیسے مرا؟"

"رات سردی سے۔"

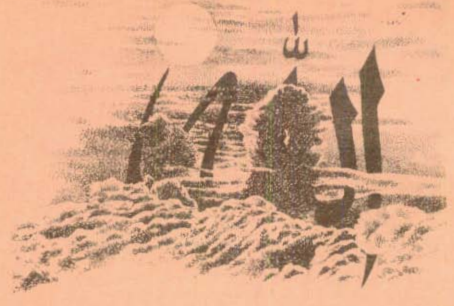

سب سے عظیم

عمران جمیل، لاہور

دُنیا کا سب سے عظیم نام "اللہ" ہے۔
دُنیا کا سب سے عظیم مذہب "اسلام" ہے۔
دُنیا کی سب سے عظیم کتاب "قرآن مجید" ہے۔
دُنیا کی سب سے عظیم شخصیت "محمد ﷺ" ہیں۔
دُنیا کی عظیم قوم "مسلمان" ہے۔
دُنیا کی عظیم دعوت "اذان" ہے۔
دُنیا کی عظیم عبادت "نماز" ہے۔
دُنیا کی عظیم زبان "عربی" ہے۔
دُنیا کا عظیم اجتماع "حج مبارک" ہے۔
دُنیا کا عظیم شہر "مکہ مکرمہ" ہے۔

دوستی

مرسلہ: ارم رؤف، راولپنڈی

دوستی کتنا پیارا لفظ ہے۔ اس کو کہتے ہوئے بہاریں مسکرا اٹھتی ہیں اور کائنات کا رنگ بدل جاتا ہے۔ دوستی وہ رشتہ ہے جس سے انسان اپنا تعلق کسی دوسرے فرد کے ساتھ استوار کرتا ہے۔ اس دنیا میں خوش نصیب ہے وہ انسان جس کو ایک چاہنے والا اور بے لوث دوست مل جائے۔ کیوں کہ زندگی کی ہر خوشی و غم میں وہ ہی اس کا سہارا ہوتا ہے۔ اچھا دوست ہیرے کی مانند ہوتا ہے اور اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اچھا دوست نہ ہی ڈھونڈنے سے اور نہ ہی دولت کے بل بوتے پر حاصل ہوتا ہے۔ دوست صرف اسی صورت میں مل سکتا ہے کہ آپ اس سے کسی قسم کا غرض نہ رکھیں۔

دوستی کا رشتہ عارضی نہیں ہوتا۔ ہزاروں برس پہلے پہاڑوں کی بلندی، جھرنوں کے ترنم، کلیوں کی معصومیت اور فرشتوں کی نورانیت کو یکجا کرکے جس رشتے کو وجود بخشا گیا اسی کا نام دوستی ہے۔

مگر آج کل کے دور میں سچے دوست کی پہچان بہت مشکل ہے۔ احمد فراز کا کہنا ہے:۔

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

موت کی یاد

ایک بزرگ سارا دن مزدوری کرتے اور تمام رات اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے۔ لوگ ان کی عبادت اور تقوے سے بہت متاثر تھے۔ ہوتے ہوتے بزرگ کی پرہیز گاری کی خبر بادشاہِ وقت تک پہنچی۔ بادشاہ نے بزرگ کو اپنے محل میں آنے کی دعوت دی۔ بزرگ جب محل میں پہنچے تو بادشاہ بہت عزّت سے پیش آیا اور ان کے سامنے کھانے کے لئے طرح طرح کی چیزیں رکھیں لیکن بزرگ نے یہ کہہ کر کھانے سے انکار کر دیا کہ

"مجھ پر موت کا خوف سوار ہے۔"

بادشاہ نے کہا.

"آپ مجھے خدمت کا موقع تو دیں۔"

بزرگ نے کہا. "ٹھیک ہے پھر مجھے دو دن کی بادشاہی چاہئے۔" بادشاہ نے بات مان لی۔

شاہی تاج پہنتے ہی بزرگ نے حکم دیا کہ بادشاہ کو جیل میں ڈال دیا جائے اور صبح ہوتے ہی اسے پھانسی پر چڑھا دیا جائے۔ پھانسی دینے سے پہلے بزرگ نے طرح طرح کے کھانے تیار کرائے اور پھر قیدی بادشاہ کو کھانے کی دعوت دی لیکن بادشاہ کس طرح کھاتا! اسے یہ فکر کھائے جائے رہی تھی کہ کل تو اس کی زندگی کا آخری دن ہے۔ موت کے خوف سے بادشاہ کی بھوک اُڑ چکی تھی۔ ایک دو نوالے کھانے کے بعد اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ بزرگ نے کہا۔ "پیٹ بھر کر کھاؤ۔" بادشاہ بولا۔ "کیسے کھاؤں؟ کل تو میری زندگی کا آخری دن ہے۔" یہ سن کر بزرگ مسکرائے اور بولے "یہی بات تو میں کہتا تھا کہ جس کو موت کا احساس ہو جائے تو پھر اسے دنیا کی کوئی اچھی سے اچھی چیز بھی مزہ نہیں دیتی۔"

یہ کہہ کر تاج سر سے اتار دیا اور اپنی کُٹیا میں جا کر یادِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔

فضل اللہ مرحوم آنکھ مچولی کے فرض شناس کارکن تھے۔ انتقال سے کچھ عرصہ پہلے انہوں نے یہ کہانی آنکھ مچولی کے لئے لکھی تھی۔

دو پھُول بے چارے

مرسلہ...... نظیر احمد، کوٹری

دور کسی ندّی کے کنارے
پھُول کھِلے دو پیارے پیارے
اور کسی گاؤں سے آکر
دو لڑکوں نے ہاتھ بڑھا کر
توڑ لئے وہ پھول بے چارے
لگتے تھے جو سب کو پیارے

کیک والے جنّات

کیک والے جنات ہمیں گھور رہے تھے اور ہم ....

لبنیٰ سعدیہ، عزیز آباد کراچی

میں اپنے کمرے میں بیٹھ کر امتحان کی تیاری کر رہی تھی کہ آپا کمرے میں داخل ہوئیں۔ "تم ابھی تک سوئیں نہیں؟ گھڑی دیکھو! ایک بج رہا ہے۔" انھوں نے کہا۔

میں نے جواب دیا

"تھوڑی دیر میں سو جاؤں گی۔ ویسے بھی جب تک سوالات یاد نہ ہوں میں کیسے سو سکتی ہوں؟"

"تمہارا تو ہر وقت یہی جواب ہوتا ہے۔ مس پڑھاکو!" انھوں نے ہلکے سے غصّے سے کہا۔

"رات بھر جاگ جاگ کر پڑھتی ہو اور صبح دیر تک سوتی رہتی ہو۔ اسکول جانے کے لئے بھی تمہیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھانا پڑتا ہے۔"

"آپا! بس تھوڑی دیر اور ...... آپ کو معلوم نہیں اس بار میں اسکول میں پوزیشن لانا چاہتی ہوں۔"

"ہنہ! یہ منہ اور مسور کی دال! پوزیشن لائیں گی" آپا بڑ بڑاتی ہوئی واپس چلی گئیں اور میں نے دوبارہ کاپی اٹھالی۔

کچھ دیر بعد مجھے تھکن محسوس ہوئی اور میں نے کاپی میز پر رکھ کر کرسی سے ٹیک لگا لی اور کہانیوں والی ایک کتاب اٹھا کر اس کے ورق الٹنے پلٹنے لگی۔ کہانی کا نام تھا "کیک والے جنّات" مجھے یہ عنوان دیکھ کر بے حد ہنسی آئی اور میں تھوڑے سے

تجسّس کے ساتھ اس کہانی کو پڑھنے لگی جس میں جنّات سالگرہ منا رہے تھے۔ پڑھتے پڑھتے میں اوپر چھت پر چلی گئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگی تو ساری تھکن اتر گئی۔ اچانک میری نظر کچھ دور درختوں کے جھُنڈ پر پڑی۔ یہ کیا؟ درختوں میں سے چار خوفناک صورتوں والے جن نکل رہے تھے ان کے کالے کالے کپڑے ہوا میں لہرا کر خوفناک آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ میرے تو ہاتھوں کے طوطا، مینا، کبوتر سب ہی اڑ گئے۔ "یا اللہ خیر۔" میں نے ایک نعرہ لگایا اور الٹے پاؤں نیچے بھاگی۔ گرتی پڑتی سیڑھیاں اتری اور صحن میں آگئی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور میرا دم لبوں پر آگیا۔ وہ چاروں جنّات صحن میں اُتر رہے تھے۔ "یا اللہ اب میں کہاں جاؤں؟"

میں نے گھبرا کر سوچا۔ کمرے کا دروازہ کھُلا ہوا تھا۔ میں جلدی سے کمرے میں چلی گئی مگر کمرہ بالکل خالی تھا۔

"یاالٰہی! یہ سب گھر والے کہاں چلے گئے؟ شاید دوسرے کمرے میں ہوں" میں دوسرے کمرے کی طرف جانے کے لئے پلٹی مگر یہ کیا؟ کمرے کے واحد دروازے پر وہ چاروں جن مجھے اپنی لال لال آنکھوں سے گھور رہے تھے۔

"کک ...... کک ...... کیا ...... چا ...... ہتے ...... ہو؟" میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

ان میں سب سے بڑے جن نے بھیانک انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "کچھ بھی نہیں! دراصل آج ہم سب کیک کھا رہے تھے، اتنے میں آپ ہماری کہانی پڑھنے لگیں تو ہم نے سوچا کہ آپ ہم سے اتنی محبت کرتی ہیں، کیوں نہ ہم آپ کو بھی تھوڑا سا کیک کھلائیں۔" میں نے گھبرا کر دیکھا۔ ایک چھوٹا سا جن بڑے سے تھال میں بڑا سا کیک اٹھائے۔ لمبے لمبے دانت نکالے مسکراتا (مجھے ڈراتا ہوا) میری طرف بڑھ رہا تھا۔

"مم ...... مم ...... میں کیک نہیں کھاتی ...... کک ...... کک ...... کیوں کہ ڈاکٹر نے مجھے میٹھا کھانے سے منع کیا ہے۔"

میں گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ "ہم کچھ نہیں جانتے!! کیک تو کھانا ہی پڑے گا!!!" بڑے جن نے چھوٹے جن کو اشارہ کیا اور وہ کم بخت اپنی بھیانک مسکراہٹ سجائے لمبے لمبے دانت باہر نکالے، پھٹے پھٹے دیدوں کے ساتھ کیک کا تھال لئے میری طرف بڑھنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے کم بخت کیک کھلانے کے لئے نہیں بلکہ میرا خون پینے کے لئے میری طرف بڑھ رہا ہے (اس کی ڈراؤنی شکل کو دیکھ کر ہی میرا کئی گنا خون خشک ہو گیا تھا) میں گھبرا کر پیچھے ہٹی تو کسی چیز سے ٹکرا کر نیچے گر پڑی اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو پتہ چلا کہ کہانی پڑھتے پڑھتے میز پر ہی سر ٹکا کر سو گئی تھی۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ڈرتے ہوئے جلدی جلدی اپنی کتابیں کاپیاں سمیٹیں اور نیچے کمرے کی

طرف بھاگی لیکن کسی چیز سے اُلجھ کر گر ہی پڑی۔ نیچے کہانی کی کتاب پڑی تھی جس کے سرورق پر کیک والے جنات کیک لئے کھڑے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کیک کھانے کا کہہ رہے ہوں۔ انہیں دیکھ کر میری تو ڈر کے مارے چیخ ہی نکل گئی۔ جلدی سے بکھری ہوئی کتابیں سمیٹ کر چھلانگیں مارتی ہوئی میں نیچے سونے کے کمرے میں آگئی۔ آپا نے پوچھا۔

"کیا ہوا؟" "کک...... کک کچھ نہیں!"

میں نے ہکلاتے ہوئے کہا اور آپا کے گلے سے چمٹ کر سو گئی۔

تنہائی

محمد اورنگ زیب، وہاڑی

مشہور مصنف "لارڈ بیکن" لکھتا ہے کہ!

"جتنا بڑا شہر ہو اتنی ہی بڑی تنہائی ہوتی ہے۔"

چھوٹی آبادیوں میں لوگوں کا آپس میں میل جول ہوتا ہے، محبت و یگانگت پائی جاتی ہے۔ لوگ دُکھ سُکھ میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ جبکہ بڑے شہروں میں بے تعلقی اور نفسانفسی کا عالم ہوتا ہے۔ ہمسائے کو ہمسائے کی خبر نہیں ہوتی۔ دُکھ درد میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ جو شہر جتنا بڑا ہو گا، ایک حسّاس اور درد مند انسان اپنے آپ کو اتنا ہی زیادہ تنہا محسوس کرے گا۔

ماہنامہ اوٹ پٹانگ

بچّوں کا انوکھا

اور منفرد رسالہ

ندیم حیدر رضوی، ماڈل کالونی (کراچی)

اس اشتہار پر نہ جائیے!

ہم نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اگر آپ لکھنے والے ہیں تو ہمارے رسالے کے لئے لکھئے اور معاوضہ حاصل کیجئے۔ ہمارا معاوضہ جو ہم آپ کو دیں گے درج ذیل ہے:۔

نظمیں ۵ روپے پاؤ، قومی گیت ۴۵ روپے چھٹانک، افسانے ۲۷ روپے کلو، مزاحیہ تحریریں ۳۵ روپے کلو اور لطیفے ۱۰ روپے کلو۔

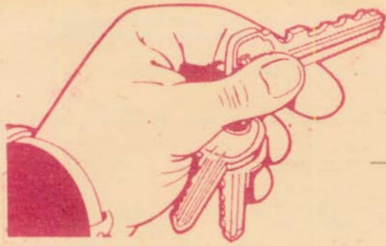

معلومات ہی معلومات

اظہر خان، کراچی

(۱) جگنو اور دوسرے حیوانات و نباتات سے نکلنے والی روشنی کو سائنسی اصطلاح میں کیا کہا جاتا ہے؟

(۲) کارٹولوجی کس علم کے مطالعے کو کہتے ہیں؟

(۳) دنیا کا سب سے بڑا ایٹمی بجلی گھر کہاں واقع ہے؟

(۴) کس سیّارے کے کرّہ ہوائی میں صرف کاربن ڈائی آکسائڈ ہے؟

(۵) مسلم لیگ کا نام کس نے تجویز کیا؟

(۶) اس واحد دھات کا نام بتائیے جو پاکستان برآمد کرتا ہے؟

(۷) سمندری پانی میں نمک کے بعد سب سے زیادہ مقدار کس چیز کی ہے؟

(۸) اے۔ ڈے کس دن کو کہا جاتا ہے؟

(۹) "شمس العارفین" کس کو کہا جاتا ہے؟

(۱۰) ٹوکن منی کس دھات کو کہا جاتا ہے؟

(۱۱) "سندھی ادب کا چاسر" کس شاعر کو کہتے ہیں؟

(۱۲) بتائیے اولمپک گیمز کا موٹو کیا ہے؟

جوابات انہی صفحات پر تلاش کریں!

کیا آپ کو معلوم ہے؟

...... آسٹریلیا میں پائے جانے والا خرگوش کے برابر لیکن کینگرو کی طرح اپنے بچے کو پیٹ کی تھیلی میں رکھنے والا جانور بینڈی کوٹ (BANDICOOT) ہے۔

...... بندر کے دو دماغ ہوتے ہیں۔ ایک جسم کو کنٹرول کرتا ہے اور دوسرا دُم کو کنٹرول کرتا ہے۔

...... سڈنی کے چڑیا گھر میں ایک مچھلی کا دھڑ نہیں ہے۔ صرف سر اور چھوٹی سی دُم ہے۔

...... برطانیہ پہلی بار سولھویں صدی میں گدھے سے متعارف ہوا تھا۔ اس سے پہلے یہ جانور وہاں نہیں تھا۔

...... دودھ پلانے والا جانور پلیٹی پس (PLATIPUS) زہریلا ہوتا ہے اور یہ دودھ پلانے والا واحد زہریلا جانور ہے۔

مرسلہ: اظہر اقبال صدیقی، کراچی

کیٹی بندر

گل شہزادہ اعجاز احمد میمن

کیٹی بندر ایک بہت چھوٹا شہر ہے۔ یہ دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ہے۔ یہ سندھ کا آخری شہر کہلاتا ہے۔ یہاں کی آبادی ۱۲۰۰ ہے۔ یہاں لوگ غریب اور ماہی گیر پیشہ ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا زیادہ تر پیشہ مچھلی پکڑنا ہے۔ یہاں پر مچھلی اور جھینگوں کا فارم بھی ہے۔ جس کے مالک سیٹھ محمد ابراہیم میمن ہیں۔ یہاں کے لوگ مچھلی پکڑ کر اپنے بیوی بچّوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ مچھلی اور جھینگوں کے فارم کو سندھی میں یہاں کے لوگ (مذی) کہتے ہیں۔ یہیں سے مچھلی کراچی بھیجی جاتی ہے۔ یہاں میمن، شیخ، خاصخیلی، ماہی گیر، کئی قومیں بستی ہیں جن میں میمن بہت زیادہ تعداد میں ہیں۔ یہاں کے رستے بہت خراب ہیں۔ کیٹی بندر تک گاڑیاں نہیں آتی ہیں۔ کیٹی بندر سے (۱۰) دس میل دور گاڑیاں کھڑی ہو جاتی ہیں کیوں کہ آگے راستہ ٹھیک نہیں۔ لوگ پیدل کیٹی بندر آتے ہیں۔ یہاں لائٹ وغیرہ بھی نہیں ہے۔ حکومتِ پاکستان کو کیٹی بندر پر خصوصی توجہ دینی چاہئے۔

سرکس کا بندر

ڈسکو ناچ دکھاتا ہے　　پیسے خوب کماتا ہے
شوق سے کیلے کھاتا ہے　　اب سرکس ہے اس کا گھر

یہ ہے سرکس کا بندر

منکو بندر اس کا نام　　رقص دکھانا اس کا کام
اونچا سا ہے اس کا بام　　اچھلے کودے مست قلندر

یہ ہے سرکس کا بندر

ہر بستی میں دھوم مچائے　　لوگوں کا دل خوب لُبھائے
جو نہ دیکھے وہ پچھتائے　　شوخی اس کے چہرے پر

یہ ہے سرکس کا بندر

ساتھی بچپن کے

افراسیاب خان ۱۳سال ہشتم
انگلش سی ایس ایس امریکن اسکول
موضع وڈاکخانہ شیدو، محلہ حاجیاں، تحصیل نوشہرہ

ممتاز علی بہنور ۱۷سال دہم
انگلش ڈاکٹر گورنمنٹ ہائی اسکول
خان محمد بہنور، میر پور۔ پرانا

محمد عرفان ۱۲سال ہشتم
ریاضی انجینئر گورنمنٹ بوائز اسکول
مکان نمبر ۳۷۵ ایس ایف، ملیر توسیعی کالونی کراچی

شفق جاوید ۱۵سال نہم
انگلش بزنس مین لاسال ہائی اسکول
افغان آباد۔ گلی ۱۱ سیون اسٹار پریس، فیصل آباد

ساجد الرحمٰن ۱۵سال دہم
اردو خدمت خلق کمپری ہنسو اسکول
مکان ۲ گلی ۵ اے ایریا، قیوم آباد، کراچی

عبدالرحمان ۱۰سال پنجم
سائنس فوجی کمانڈو گورنمنٹ بوائز اسکول
محمد صغر نزد تھانہ گرماکھ گوجرانوالہ

محمد عمران ۱۳سال نہم
سائنس بزنس کرنا مجید کالونی اسکول
مکان ۱۲۵سی، مجید کالونی لانڈھی، کراچی ۲۲

ظفر اقبال پاشا ۱۴سال نہم
عربی حافظ گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول
ڈونگہ بونگہ ضلع بہاولنگر

عمر ریاض ۱۷سال فرسٹ ایئر
فزکس انجینئر گورنمنٹ ہائی اسکول
بمقام وڈاکخانہ ساگری براستہ دینہ ضلع جہلم

ظہیر فاروق ۱۳سال دہم
ریاضی انجینئر بی ایم بی گورنمنٹ
فلیٹ نمبر ۱۰، این حسین بلڈنگ ڈاکٹر داؤد پوتا روڈ کراچی

شاہ زمان ۱۵سال نہم
اردو فوجی گورنمنٹ بوائز اسکول
جمعہ گل کریانہ اسٹور اورنگی ٹاؤن سیکٹر ۱۰، کراچی

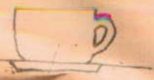

چائے کے کپ کی کہانی

ساجدالرحمٰن، قیوم آباد

مجھے چائے کا کپ کہتے ہیں۔ میری یہ شکل و صورت آپ دیکھ رہے ہیں۔ کبھی حسن و رعنائی میرے چہرے پر برستی تھی۔ اسے انقلاب زمانہ کہئے یا انسان کی سرد مہری کہ آج میرا کوئی مقام نہیں۔ میں آپ کو اپنی کہانی سناتا ہوں۔

میرا تعلق مٹی سے ہے۔ وہی مٹی جس سے تخلیق پاکر یہ انسان اتراتا پھرتا ہے۔ مجھے ماضی کے وہ دن یاد ہیں جب مٹی سے ایک کمہار نے مجھے یہ شکل و صورت عطا کی۔ یہ شکل اختیار کرنے سے پہلے مجھے بہت سے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا۔ کتنے ستم اور سنگینیاں تھیں جو اس ننھی جان نے برداشت کیں۔ مٹی کے ایک بڑے ڈھیر سے کچی مٹی لی گئی۔ اسے کوٹ کوٹ کر باریک کیا گیا پھر اسے صاف کرکے سردی کے دنوں میں ٹھنڈا پانی ملا کر خمیر تیار کیا گیا۔ کمہار کے تابڑ توڑ ہاتھ میرے جسم پر پڑتے رہے تاکہ تمام کس بل نکل جائیں اور مجھے اپنی مطلوبہ شکل دے سکے۔ پھر اس نے گھومتے ہوئے چک پر رکھ دیا۔ اپنے ہاتھوں سے مجھے یہ شکل عطا کی اور ایک باریک دھاگے کی مدد سے دوسری مٹی سے کاٹ کر الگ دھوپ میں رکھ دیا جہاں اور بھی میری طرح کے کئی مظلوم پڑے تھے۔ جب میں سوکھ گیا تو ایک آرٹسٹ نے میرے جسم پر خوشنما بیل بوٹے بنائے۔ اب میں ایک کپ تو بن گیا تھا مگر ناپختہ اور خام۔ ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ کر اپنی جان سے ہاتھ دھو سکتا تھا لیکن کمہار نے مجھے پختہ کرنے کے لئے ایک بھٹی میں رکھ دیا بس کچھ نہ پوچھئے۔ بھٹی میں آگ کے جلنے کے ساتھ ہی میرا تمام جسم سلگنے لگا۔ خدا خدا کرکے سات دن کے بعد اس جہنم سے آزادی کا پروانہ ملا۔

بھٹی سے نکالنے کے بعد ایک دکان کے شوکیس میں سجا دیا گیا اور ہر آنے جانے والوں کی نگاہوں کے تیر میرے جگر میں ترازو ہونے لگے۔ آخر ایک دن ایک بڑھیا کی نظرِ انتخاب مجھ پر پڑی اور میں دکان کے شوکیس سے نکل کر اس کے گھر میں آگیا۔ مگر ایک دن مہمانوں کی آمد پر استعمال کے لئے نکال لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ظلم و ستم کا ایک نیا باب شروع ہوگیا۔ میں نے بھی بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر صبر و شکر کرنا سیکھ لیا۔ کبھی تو گرم گرم چائے سے مجھ کو بالب بھر دیا جاتا اور کبھی کوئی بچہ ٹھنڈے پانی میں ڈبکیاں دیتا۔ کئی دفعہ میں نے نمونیے اور سرد گرم ہونے کی مصیبت پائی۔ کبھی کوئی بچہ مجھ میں دودھ ڈال کر پینا بھول گیا تو پڑے پڑے اس میں بو پیدا ہو گئی جس سے میرا دماغ پھٹ گیا۔ میرا رنگ و روپ بکھر

گیا۔ وہ رعنائی اور دل آویزی جو کبھی میرا سرمایۂ فخر تھی اب ختم ہو چکی تھی۔ گھر کے کسی بھی شخص کی نظر میں میرا کوئی مقام نہ رہا۔

پھر ایک دن یوں ہوا کہ جمعدار نے مالکن سے چائے مانگی اس نے مجھ سے جان چھڑانے کے لئے مجھے اس کے لئے مخصوص کر دیا اور بڑے اہتمام سے اسے چائے عنایت کی۔

جمعدار جب بھی صفائی کرنے آتا۔ مالکن مجھ میں چائے بھر کر چائے جمعدار کو دیتی اور وہ اپنے گندے سندے ہاتھوں سے بڑے مزے کے ساتھ سُڑپ سُڑپ کر کے چائے پیتا۔

پھر ایک دن میری جمعدار سے بھی جان چھوٹ گئی۔ کرکٹ کھیلنے والے بچّوں نے جو شاٹ مارا تو میں گیند لگنے سے زمین پر گر پڑا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔

جوابات:۔

(۱) سرد روشنی۔
(۲) نقشوں کے مطالعہ کو۔
(۳) اونیٹریو (کینیڈا) میں۔
(۴) زہرہ۔
(۵) سر محمد شفیع نے۔
(۶) کرومائٹ۔
(۷) چونے کی۔
(۸) ہر سال گیارہ نومبر کا دن عالمی جنگوں کے ہلاک شدگان کی یاد میں منایا جاتا ہے۔
(۹) نکل۔
(۱۱) شاہ عبداللطیف بھٹائی۔
(۱۲) تیزتر۔ مضبوط تر۔ اور بلند تر۔

بھولا

حافظ مظفر محسن

بچّوں پر رعب جماتا ہے
شیطان کا چیلا ہے بالکل
آتا ہی نہیں کچھ کام اسے
وہ ماسک لگا کر چہرے پر
ہر وقت شرارت کرتا ہے
وہ جھوٹی شکایت کرتا ہے
کرتے ہیں مجھے سب شرمندہ
میں عقل سے اپنی لکھتا ہوں
پھر بھی ہے وہی محبوب مجھے

نقلیں بھی خوب اڑاتا ہے
"بھولا" بھی وہی کہلاتا ہے
اور باتیں خوب بناتا ہے
بچّوں کو خوب ڈراتا ہے
ہر روز سزائیں پاتا ہے
ابّو سے مجھے پٹواتا ہے
معصوم وہی بن جاتا ہے
وہ میری نقل لگاتا ہے
روٹھوں تو آ کے مناتا ہے

ٹی وی آرٹسٹ لیلیٰ زبیری کہتی ہیں
"جب سے میں معیار بناسپتی میں کھانے پکارہی ہوں میرے بچے کھانا بڑے شوق سے کھاتے ہیں!"
صحت، توانائی، لذّت کا معیار
معیار بناسپتی سے برقرار
عام بناسپتی سے قیمت صرف تھوڑی زیادہ
مگر معیار بناسپتی کوالٹی میں بہت بہتر!
حبیب آئل ملز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
D-38 ایس۔آئی۔ٹی۔ای کراچی فون: 292006-292926
معیار
بناسپتی

ننجا ٹرٹل لنچ بکس بالکل مفت
۲ نیچرل ٹوتھ پیسٹ کے درمیانے سائز کے پیکس خریدیے
اور ۲۰ روپے کا ننجا ٹرٹل لنچ بکس مُفت حاصل کیجئے۔
Natural
Natural
Natural
Natural
Natural
TOUCHME
Natural
اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے کہ
پاکستان کا اعلیٰ معیار کا
نیچرل ٹوتھ پیسٹ اور بچّوں
کے لئے ۲۰ روپے کا خوبصورت
لنچ بکس مفت۔
معیاری ٹوتھ پیسٹ۔ زیادہ بچت اور بچوں کی خوشیاں!